اوپن ڈیفنس

اعلیٰ تعلیم کی سند جاری کرنے سے پہلے تعلیمی ادارے مختلف قسم کے امتحانات لیتے ہیں ۔ ان میں سے ایک طریقہ اوپن ڈیفنس کا ہے ۔یہ امتحان عام طور پرپی ایچ ڈی یا ایم فل کی ڈگری دینے سے قبل لیا جاتا ہے جس میں امیدوار کو اس شعبے کے ماہرین اور طلبا ء کے سامنے اپنے مقالے کادفاع کرنا ہوتا ہے ۔ اس طریقہ امتحان میں حاضرین میں سے کوئی بھی شخص مقالہ نگار سے اس کے مقالے کے حوالے سے کوئی بھی سوال یا اعتراض کرسکتا ہے اور اسے اپنے نقطہ نظر اور کام کا دفاع کرنا ہوتا ہے ۔
دنیا میں جانچ کے جتنے طریقے رائج ہیں ، یہ طریقہ قیامت کی اس پیشی سے سب سے زیادہ قریب ہے جس کا سامنا ہم میں سے ہر شخص کو قیامت کے دن کرنا ہے ۔اُس روز مقالے کی جگہ ہمارا اعمال نامہ ہو گا ۔ماہرین فن اور طلبا کی جگہ اولین تا آخرین پوری انسانیت تماشائی ہو گی اور خاص ہم سے متعلق لوگ اردگرد موجود ہوں گے ۔انبیائے کرام اور شہدا گواہی کے لیے موجود ہوں گے ۔ ان کے پیغام کی بنیاد پر ہمارے اعمال نامے کا احتساب شروع ہو گا۔ایمان پرکھا جائے گا۔ اخلاق دیکھے جائیں گے ۔اعمال کی جانچ ہو گی۔
کسی کا حق مارا ہو گا تو وہ سوال کرنے کھڑ ا ہوجائے گا۔ کسی پر الزام و بہتان لگایا ہو گا تو وہ اپنا مقدمہ لے کر آجائے گا۔ کسی کی جان مال عزت وآبرو کو نقصان پہنچایا وہ بھی اپنا بدلہ مانگنے آجائے گا۔ پھر رسوائی شروع ہو گی۔ پکڑ کا آغاز ہو گا۔ بدبختی کا فیصلہ ہو گا اور جہنم کے دروازے اس شخص پر کھول دیے جائیں گے ۔ہاں جس نے توبہ کی۔ معافی مانگی ۔اسے جنت کی ڈگری دے دی جائے گی۔
ہم میں سے ہر شخص کو اس ''اوپن ڈیفنس ''سے گزرنا ہے ۔یہ بات یاد رکھ کر جس نے زندگی گزاری وہ سرخرو ہو گا۔ جو بھولا وہ جہنم کا ایندھن بن جائے گا۔

آزادی:مغرب سے ڈائیلاگ کی ضرورت

قرآن مجید کا حکم ہے کسی قوم کی دشمنی تمھیں عدل سے نہ ہٹادے ، (المائدہ5:8)۔ اس لیے ایک مسلمان کی ذمہ داری ہے کہ ہر معاملے میں اس کا خیال رکھے ۔ ا ن مغربی اقوام کے معاملے میں بھی جن سے ہمیں بہت سی شکایات ہیں ۔تاہم توہین رسالت کے حوالے سے فرانس میں حالیہ واقعے کے بعد مغربی دنیا نے جو رویہ اختیار کیا ہے وہ کسی طور قابل فہم نہیں ۔
سوال یہ ہے کہ آزادی کا یہ مطلب کس طرح ہو گیا کہ کسی ایسی شخصیت کے توہین آمیز خاکے شائع کیے جائیں جو اربوں لوگوں کے نزدیک محترم ہے ۔کسی مقدس ہستی کو تو چھوڑ یے ، آزادی کا یہ مطلب بھی کیسے ہو سکتا ہے کسی عام انسان کی تضحیک کی جائے ، اس کا مذاق اڑ ایا جائے اور اسے گالیاں دی جائیں ، اسے بدنام کیا جائے ۔
آزاد ی اظہار بڑ ی محترم چیز ہے ، مگر اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر شخص کو اپنی بات دلائل سے کہنے کی آزادی ہو۔ اختلاف رائے کی آزادی ہو۔ حتیٰ کہ کسی مذہب یا مذہبی لیڈر کی مخالفت کی بھی آزادی ہونی چاہیے ۔ کسی کو ہمارے مذہب سے اختلاف ہے تو تہذیب کے دائرے میں رہ کر کرے ، ہم اس کا جواب دیں گے ۔ مگر پھکڑ پن اورمسخرے پن کو آزادی کے نام پر کیسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے ؟
اب وقت آ گیا ہے کہ مغرب سے یہ سوال پوچھا جائے کہ کسی کی توہین ، آزادی کیسے ہو سکتی ہے ؟لوگوں کی دل آزاری ایک انسانی قدر کیسے ہو سکتی ہے ؟اگر دہشت گردی قابل مذمت ہے تو کردار کشی بھی قابل مذمت ہونی چاہیے ۔اگر دہشت گردی کی حمایت کرنا ایک مسخ ذہنیت ہے تو توہین رسالت کی حمایت بھی ایک مسخ شدہ ذہنیت ہے ۔
ضرورت اس بات کی ہے کہ اب اس موضوع پر مغرب سے باقاعدہ مکالمہ شروع ہو۔ ورنہ انسانیت مزید تباہی

دیکھے گی۔

آگ اور ہماری سیاسی لیڈر شپ

پچھلے دنوں کراچی اور لا ہور میں آگ لگنے کے دو واقعات یکے بعد دیگرے پیش آئے ۔ کراچی کے واقعے میں ٹمبر مارکیٹ کے باسی اپنی زندگی بھر کی جمع پونجی سے ہاتھ دھوبیٹھے اور لا ہور کے واقعے میں 14افراد نقدی حیات ہی گنوابیٹھے ۔
آگ کوئی دھماکہ نہیں ہوتا جو ایک لمحے میں بربادی پھیلادے ۔آگ لگنے اور پھیلنے کے درمیان عام طور پر اتنا وقفہ ہوتا ہے کہ فائر برگیڈ بروقت پہنچ کر نقصان کو کم سے کم کر دے ۔ یا شہری انتظامیہ پہلے ہی سے ایسے انتظامات کرے کہ آگ لگنے کے بعد پھیل نہ سکے اور لوگ متاثرہ جگہوں سے باآسانی باہر نکل سکیں ۔ یہ فائر برگیڈ اور یہ حفاظتی انتظامات کرنا بلدیاتی اداروں کی ذمہ داری ہوتی ہے ۔
ہمارے ملک میں جمہوریت کی چیمپین سیاسی لیڈر شپ کا حال یہ ہے کہ اس نے برسہا برس سے ملک میں بلدیاتی انتخابات ہونے ہی نہیں دیے ۔سابق چیف جسٹس نے ہر طرح کی کوششیں کر لیں ، مگر وہ ناکام ہوکر اپنے گھر چلے گئے ، چاروں صوبائی حکومتوں نے انتخابات کروا کر نہ دیے ۔ کیوں ؟ صرف اس لیے کہ وہ بلدیات کا نظام اپنے من پسند افسروں کے ذریعے سے چلا کر کرپشن کے مواقع پیدا کرنا اور تمام اختیارات اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں ۔ان کو صرف اپنے اقتدار اور ناجائز پیسے کمانے کی پروا ہے ، ملک اور قوم کی نہیں ۔
اس کرپٹ اور آمرانہ سوچ کا نتیجہ مسلسل ایسے سانحات کی شکل میں نکلتا رہتا ہے ۔ یہی سوچ ہے جس کی بنا پر تھر میں 300سے زائد بچے غذائی قلت اور دیگر وجوہات کی بنا پر مرچکے ہیں ۔ مگر کوئی ذمہ داری قبول کرتا ہے نہ کوئی مستعفی ہوتا ہے اور نہ اموات رکتی ہیں ۔یہی وہ سوچ ہے جس کی بنا پر دہشت گرد پچاس ہزار سے زائد پاکستانیوں کو مارچکے ہیں اور اس کے بعد کہیں جا کر ملک میں پہلی دفعہ اس حوالے سے کوئی پالیسی بنانے کا عمل شروع ہوا ہے ۔ وہ بھی فوج اور قوم کے شدید دباؤ پر ۔ یعنی پچاس ہزار سے زائد لوگوں کے مرنے کے بعد ایک بڑ ا سانحہ ہوا جس پر شدید عوامی ردعمل کے بعد حکمرانوں کو یہ خیال آیا ہے کہ دہشت گردی روکنے کے لیے کوئی پالیسی ہونا چاہیے ۔ درحقیقت حکمران کلاس کی یہ غفلت اور بے حسی دہشت گردی سے زیادہ بڑ ا مسئلہ ہے ۔
یہ حکمران کلاس کسی ایک جماعت کا نام نہیں ۔ اس وقت تمام اہم اور بڑ ی جماعتیں بشمول مسلم لیگ، پیپلز پارٹی اور تحریک انصاف جیسی بڑ ی اور ملک بھر میں اپنی اساس رکھنے والی جماعتیں اپنی اپنی جگہ اقتدار میں موجود ہیں ۔ مگرسب کا رویہ ایک ہی ہے ۔کوئی بلدیاتی انتخاب کرانے کوتیار نہیں ۔یہ جمہوریت کے اس مسلمہ اصول کی خلاف ورزی ہے جس کی وجہ سے یہ اقتدار میں ہیں ۔ یہ اس آئین کی پامالی ہے ، جس سے وفاداری کا حلف لے کر یہ اقتدار کے مزے لوٹ رہے ہیں ۔
حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کا اصل مسئلہ پاکستان کی نا اہل اور کرپٹ سیاسی قیادت ہے ۔ یہ فوجی آمریت کو گالیاں دیتے ہیں ، مگر جہاں موقع ملتا ہے معمولی سا اختیار بھی چھوڑ نے کے لیے تیار نہیں ہوتے ۔یہ اقتدار کو کوئی ذمہ داری نہیں بلکہ لوٹ مار کرنے اور اپنا سیاسی اثر ورسوخ بڑ ھانے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں ۔یہی سبب ہے کہ اس ملک میں بڑ ے سے بڑ ا حادثہ ہوجائے ، کوئی وزیر ، وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کبھی مستعفی نہیں ہوتا۔
لوگوں کو سمجھنا چاہیے کہ جمہوریت سیاسی جماعتوں کو اقتدار میں پہنچانے کا نام نہیں ۔ ان کے احتساب کا بھی نام ہے ۔جس روز لوگوں کو یہ بات سمجھ میں آ گئی، کسی ٹمبر مارکیٹ میں اور کسی انارکلی میں انسانی جان اور مال کی ایسی بربادی نہیں ہو گی۔

مذہب کا المیہ

''مذہب کا اصل المیہ کیا ہے ، کیا کوئی صاحب بیان کرسکتے ہیں ؟''، عارف نے سوال دہرایا۔ مگر خاموشی رہی۔اس سے پہلے کئی جواب دیے جا چکے تھے ، مگر عارف نے کسی جواب پر اطمینان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ آخر کو وہ خود ہی جواب دینے لگے ۔
''مذہب ایک عقلی دعوت ہے ۔ مگرسانحہ یہ ہے کہ مذہب کی اس عقلی دعوت کے حصے میں معقول لوگ نہیں آتے بلکہ اکثر وبیشتر جذبات کے مارے ہوئے لوگ اسے اپنی دلچسپی کا موضوع اور اپنی زندگی بنالیتے ہیں ۔یہی مذہب کا اصل المیہ ہے ۔''
لوگوں کے لیے یہ جواب حیرت انگیز تھا۔اس حیرت کو ان کے چہروں پر پڑ ھا جا سکتا تھا۔ ایک صاحب سے رہا نہ گیا۔ وہ سوال کربیٹھے ۔
''مگر اس کا سبب کیا ہے ؟''
''سبب یہ ہے کہ عام طورپر لوگ مذہب کوبطور ایک سماجی ورثہ اپناتے ہیں جو ماں باپ اور ماحول سے خودبخود مل جاتا ہے ۔ اپنی وراثت سے انسان کا جذباتی تعلق ہوتا ہے ۔ یوں مذہب سے ایک جذباتی تعلق پیدا ہوجاتا ہے ۔''
''مگر یہ المیہ کیسے بن گیا؟''، ایک اور صاحب نے سوال کیا تو عارف بولے :
''المیہ اس لیے بن جاتا ہے کہ ایسے لوگ معاشرے میں مذہب کی بدترین ترجمانی کرتے ہیں ۔ آپ لوگوں نے میرے سوال کے جو جوابات دیے تھے یعنی فرقہ واریت، انتہا پسندی، تعصب، عدم برداشت، دہشت گردی، مذہب کے نام پر استحصال ، پیری مریدی کا سلسلہ؛ یہ سب چیزیں دراصل بے لگام جذباتیت کے شاخسانے ہیں ۔ایسے جذباتی لوگ جب مذہب کی ترجمانی کرتے ، اس کو اپناتے ، اس کی طرف لوگوں کو بلاتے ہیں تو پھر یہ سارے مسائل وجود میں آ جاتے ہیں ۔''
یہ بات لوگوں سے ہضم نہیں ہوپا رہی تھی۔ ایک اور صاحب نے اعتراض کیا۔
''انسان تو جذبات کے سہارے جیتا ہے اورمذہب بھی تو جذبات کی طرف بلاتا ہے ۔''
''نہیں یہ تصور درست نہیں کہ مذہب جذبات کی طرف بلاتا ہے ۔ قرآن اول تا آخر پڑ ھتے چلے جائیں ، اس نے اپنی دعوت کوخالص عقلی بنیادوں پر اٹھایا ہے ۔ہاں عمل پر ابھارتے ہوئے وہ کبھی جذباتی اپیل کر دیتا ہے مگر وہ دعوت عقلی دلائل کی بنیاد پر دیتا ہے ۔یہی حقیقت اس نقطہ نظر کی تردید کے لیے کافی ہے ۔ باقی رہے انسان تو بے شک وہ جذبات کے سہارے جیتا ہے ، لیکن زندگی کے بیشتر فیصلے وہ عقلی بنیادوں پر کرتا ہے ۔یہ ستم وہ صرف مذہب پر ڈھاتا ہے کہ جذباتی انداز سے اس کے حق و باطل کا فیصلہ کر کے مطمئن ہوجاتا ہے ۔''
آخری بات کہتے ہوئے عارف کے لہجے میں جلال آ گیا تھا۔
''یاد رکھیے مذہب کے حق و باطل کے سنگین ترین مادی نتائج آخرت میں نکلیں گے ۔ اللہ تعالیٰ کسی غلط عقیدے کو اس بنا پر برداشت نہیں کریں گے کہ یہ آپ کے جذبات کو سکون دیتا تھا۔ یا آپ کی اس سے جذباتی وابستگی تھی۔آپ لوگوں کو معقولیت کے ساتھ صحیح غلط کا فیصلہ کرنا ہو گا ورنہ اس کے بدترین نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہوجائیں ۔جذبات میں آ کر آپ کسی ٹرین کے سامنے کھڑ ے ہوجائیں تو وہ آپ کے لیے نہیں رکے گی۔ کچل کر نکل جائے گی۔ یہی معاملہ قیامت کی ٹرین کا ہے ۔ قیامت کی ٹرین بھی آپ کو آپ کے جذباتی انداز فکر سمیت کچل ڈالے گی۔اس لیے مذہبی تصورات میں ہمیشہ عقل سے مدد لیجیے ورنہ نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہیے ۔''
''مگر ہم جذبات کیسے چھوڑ دیں ۔مذہب اسلام میرا تعصب ہے ۔ میری اس سے جذباتی وابستگی ہے ۔ میں کسی عقلی دلیل پر اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔''، ایک صاحب نے جوش میں آ کر کہا۔
''اسلام چھوڑ نے کی ضرورت نہیں ۔ یہ واحد مذہب ہے جو عقل وفطرت کی بنیاد پر کھڑ ا ہے ۔ مگر کیا آپ کے مخصوص فرقے اور خاص قسم کے نظریات کی بھی یہی حیثیت ہے کہ قرآن ان کی تائید کے لیے نازل ہوا تھا۔قرآن اسلام کی کتاب ہے کسی فرقے کی نہیں ۔ہاں مگر ہم اپنے نظریات کو اسلام اور دوسروں کے

نظریات کو گمراہی سمجھتے ہیں ۔ یہ وہی جذباتی پن ہے جو مذہب کا اصل المیہ ہے اور جس کے نتیجے میں مذہب بدنام ہوجاتا ہے ۔
حقیقی مومن وہ ہے جو مذہبی تصورات ، نظریات اور عقائد کوجذباتیت کے بجائے عقل سے سمجھے ، بصیرت کی آنکھ سے پرکھے اور پھرجو سمجھا اس پر پورے جذبے سے عمل کرے ۔ اور اس کے لیے تیار رہے کہ کسی اور نے زیادہ بہتر بات سمجھادی تو وہ اسے اختیار کر لے گا ۔یہ راستہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے ۔ یہ جنت کا راستہ ہے ۔ ‘‘
عارف لمحے بھر کے لیے رکے اور مسکراتے ہوئے بولے ۔
’’آپ کا اپنے بیوی بچوں سے جذباتی تعلق ہو سکتا ہے ۔ آ پ ان سے ملنے کے لیے جذباتی ہو سکتے ہیں ۔ مگر جذبات کے سہارے آپ گھر تک نہیں پہنچ سکتے ۔ اس کے لیے ہر موڑ پر عقلی فیصلہ کرنا ہو گا۔یہی طریقہ جنت کی منزل تک پہنچنے کا ہے ۔اس راہ کا ہر موڑ عقلی فیصلہ کر کے اختیار کیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ ہر دوسرا طریقہ جہنم میں جاتا ہے ۔‘‘
عارف کی مجلس میں آج ایک اورسمندر کو کوزے میں بند کر دیا گیا تھا۔

آخری فیصلہ

اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے آگاہ کرنے کے لیے ہر دور میں انبیا اور رسول بھیجے ۔حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد ایک پوری امت یعنی یہود کو اس منصب پر فائز کر دیا گیا ۔ یعنی ان کے ذریعے سے انسانیت کو اللہ کا پیغام ملنے لگا۔ان کے لیے قانون یہ تھا کہ وہ اگر ایمان و اخلاق کے لحاظ سے اپنے معاملات درست رکھتے اور ان کے ذریعے سے دنیا تک ہدایت پہنچتی رہتی توان کو دنیا پر غلبہ اور عروج ملتا تھا۔ نافرمانی کی صورت میں دوسری قوموں کو ان پر مسلط کر دیا جاتا جو ان کے علاقوں پر قبضہ کر لیتے اور ان کو طرح طرح کے عذاب دیتے ۔
اللہ تعالیٰ کا یہ قانون تقریباً ہزار برس تک جاری رہا جس میں یہود پر اسی قانون کے تحت اچھے برے حالات آتے رہے ۔تاہم آہستہ آہستہ یہود پر قوم پرستانہ ذہن غالب آتا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں صورتحال یہ ہوئی یہودکے جرائم کی پاداش میں ان کے علاقوں پر رومیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ لیکن انھوں نے اپنے جرائم کی اصلاح کے بجائے ان کو ایک نظریاتی رنگ دے دیا اوراپنی اصلاح کے بجائے رومیوں سے آزادی کو اصل مسئلہ بنالیا۔ ایک عام آدمی کو یہ بات بڑ ی اپیل کرتی ہے کہ ہمارے علاقوں پر غیروں کا قبضہ کیوں ہے ۔ مگر یہودی علما کبھی یہ لوگوں کو نہیں بتاتے تھے کہ یہ مغلوبیت ان کے جرائم کی سزا ہے ۔اس کے بجائے وہ قوم پرستانہ جذبات کو فروغ دیتے تھے تاکہ لوگوں کی توجہ ان کے بجائے غیروں کی طرف رہے ۔
یہی وہ پس منظر ہے جس میں یہود نے حضرت عیسیٰ کا کفر کیا۔ حالانکہ صدیوں سے یہود مسیح کے منتظر تھے جن کے متعلق ان کی کتابوں میں یہ پیش گوئی موجود تھی کہ وہ ان کو نجات دلائے گا۔ یہ پیش گوئی ٹھیک تھی۔ مگر اس نجات کا طریقہ یہ تھا کہ یہود آنجناب کی دعوت پر پہلے اپنی اصلاح کریں ۔ جس کے بعد ان کا غلبہ یقینی تھا۔ مگرجب سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے یہود کی اصلاح کی کوشش کی تو یہود ان کے دشمن ہوگئے ۔اپنی طرف سے انھوں نے آنجناب کو سولی پر چڑ ھانے کی پوری کوشش کی مگر اللہ نے اپنے نبی کو ان سے بچاکر اپنی طرف اٹھالیا۔اس کے ساتھ یہود پر بدترین عذاب کا فیصلہ ہو گیا۔اس عذاب کا طریقہ یہ ہوا کہ یہود نے رفع مسیح کے بعد رومیوں کے خلاف بغاوت کر دی۔ جس کے بعد رومی فوجوں نے پوری قوت سے فلسطین پر حملہ کیا اوریہود کو تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔
نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی رحمت کی شکل میں اللہ تعالیٰ نے یہود کو ایک اور موقع دیا کہ وہ آپ پر ایمان لے آئیں ۔ مگر یہود میں قومی تعصب کے جذبات دوبارہ بھڑ ک اٹھے ۔ انھوں نے اس وجہ سے آپ کا

انکار کر دیا کہ آپ کا تعلق ان کی قوم سے نہیں بلکہ بنی اسماعیل سے تھا ۔ چنانچہ ایک دفعہ پھر یہود کو سزا دی گئی اور ان کو عرب سے نکال دیا گیا۔ان کو ہمیشہ کے لیے منصب امامت سے معزول کر کے عربوں کو دنیا کا امام بنادیا گیا۔ان کے لیے بھی قانون وہی تھا جو یہودکے لیے تھا۔ دنیا میں ہدایت کی شمع بنو گے تو غلبہ ملے گا ورنہ عذاب دیا جائے گا۔
کم و بیش چھ صدیوں بعد عربوں نے وہی کچھ کیا جویہود نے کیا تھا۔ چنانچہ تاتاریوں کا ٹڈی دل اللہ کا عذاب بن کر اٹھا اور عالم عر ب کو برباد کر کے رکھ دیا۔اس کے بعد امت کی امامت عربوں سے لے کر عجمیوں کو دے دی گئی۔چھ صدیوں کے بعد عجمیوں نے بھی وہی کچھ کیا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بطور سزا ان کے ملکوں پر مغربی ممالک کو مسلط کر دیا ۔ بدقسمتی سے مسلمانوں نے یہود کی وہی غلطی دہرائی کہ اپنی کمزوریوں کو ایک نظریاتی رنگ دے دیا۔
آج دنیا بھر میں مسلمان قیادت قوم پرستانہ جذبات میں مغرب کے خلاف نفرت کا درس دے رہی ہے ۔ مسلمان لیڈر شپ اس درجہ کی پستی میں گرچکی ہے کہ کوئی بھی فرد یا گروہ ہزاروں مسلمانوں کو مارڈالے ، مسلمانوں کے بچوں کو ذبح کر دے ، ان کی بچیوں کو اغوا کر لے ، بس وہ مغرب کو گالی دے دے ، پھر وہ مجرم تمام جرائم کے باوجود ان کا ہیرو بن جاتا ہے ۔وہ اس کے ہر جرم کی تاویل اور پردہ پوشی کرنے لگتے ہیں ۔
کوئی یہ نہیں بتاتا کہ اللہ کا قانون ہے کہ اگر مسلمان اخلاقی طور پر پست ہوں گے ، اسلام کی دعوت دینے میں غفلت کریں گے تو ان پر اللہ کا عذاب مسلط ہو گا۔یہ عذاب دوسری اقوام کے غلبے کی شکل میں ہو گا۔اس عذاب سے نکلنے کا راستہ دوسروں سے نہیں اپنے جرائم سے نفرت ہے ۔توبہ اور ذاتی اصلاح ہے ۔
مگر بدقسمتی سے آج کی مسلمان لیڈرشپ کسی ایسے شخص کی بات سننے کے لیے تیار نہیں ۔ وہ ایسے لوگوں کی بات سننے کے بجائے ان کے خلاف جھوٹی اور نفرت انگیز مہمیں چلا کر انھیں بدنام کرتے ہیں تاکہ کوئی ان کی بات نہ سنے ۔وہ سفاکی کے ساتھ ان کو قتل کر دیتے ہیں ۔ ان کو وطن اور گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیتے ہیں ۔مگر اس سرکشی کے بعد آخری فیصلہ ہوجاتا ہے ۔خدا کا عذاب بدترین شکل میں آتا ہے اورپوری قوم کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے ۔
ہماری قوم ایسے ہی ایک مرحلے پر آ چکی ہے ۔اسے آخری فیصلہ کرنا ہو گا۔ ایک طرف خدا کا قانون بیان کرنے اور سمجھانے والے خدا پرست ہیں اور دوسری طرف مذہب کا نام لے کر نفرت پھیلانے والے ہیں ۔ قوم اگر خداپرستوں کی بات سنتی ہے ، ایمان اور اخلاق کی دعوت قبول کر کے توبہ کرتی ہے تو غلبہ اور عروج اس کا منتظر ہے ۔ لیکن اگر وہ نفرت کے پجاریوں کی بات مانتی ہے تو اگلے چند برسوں میں اس قوم کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے گا جو یہود کے ساتھ کیا گیا تھا۔
اب بہت ہو گیا ۔ بہت معصوموں کو قتل کر دیا گیا ۔ اسلام کو بہت بدنام کیا جا چکا ۔ اب حد ہو چکی ہے ۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ ایک فیصلہ کر لیں ۔ اس لیے کہ اب اِس قوم کے بارے میں آسمان سے آخری فیصلہ نازل ہونے کو ہے ۔

سلسلہ روز و شب

ابویحییٰ

ہماری اصل جنگ کیا ہے ؟

اس دنیا میں انسان کا اصل مقصد

قرآن مجید اپنے اس مدعا میں آخری درجہ میں واضح ہے کہ انسان کو اس دنیا میں آخرت کی ابدی فوز وفلاح حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے ۔آخرت کی یہ اہمیت اور انسان کا جہنم کی کھائی سے بچ کر جنت کی باشاہی تک پہنچنا قرآن مجید کے نزدیک اتنا اہم ہے کہ محض فال نکالنے کے طریقے پر اگر آپ کبھی قرآن مجید کا کوئی صفحہ کھول لیں تو آپ پر یہ انکشاف ہو گا کہ قرآن کے ہر صفحے پر بالواسطہ یا بلاواسطہ

طریقے پر یہ مضمون بیان ہوتا ہے ۔
یہ بات جو میں بیان کر رہا ہوں کوئی اجنبی بات نہیں ۔سب مسلمان خواص و عوام اس بات کو مانتے ہیں اور مسلمانوں کا ہر گروہ ہر دور میں اس حقیقت کو مانتا اور بیان کرتا رہا ہے ۔ یہ قرآن مجید کا ہم پر بہت بڑ ا احسان ہے کہ اس نے ہمیں اپنی منزل کے بارے میں کسی پہلو سے بھی کسی شک و شبہ میں نہیں رہنے دیا۔ اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کا ہم پر یہ بھی بڑ ا عظیم احسان ہے کہ اس نے قرآن مجید میں واضح طور پر یہ بتادیا ہے کہ فلاح آخرت کی اس منزل تک پہنچنے کا راستہ کیا ہے ۔ یہ بات تفصیل اور اختصار دونوں طریقوں پر قرآن مجید میں بہت مقامات پر بیان کی گئی ہے ۔ جن لوگوں کو تفصیل میں یہ بات دیکھنا ہے وہ میری کتاب ’’قرآن کا مطلوب انسان ‘‘ کا مطالعہ کرسکتے ہیں ۔اس کتاب میں قرآن و حدیث کی روشنی میں وہ ایک ایک عمل بیان کر دیا گیا ہے جس کے کرنے یا نہ کرنے پر ہماری اخروی نجات موقوف ہے ۔
قرآن مجید اس تفصیل کو جب مختصر کر کے بیان کرتا ہے تو بلاشبہ سمندر کو کوزے میں بند کر دیتا ہے ۔اس اختصار میں وہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہمیں جو اعمال کرنے ہیں اور جن کو قرآن مجید عمل صالح کہتا ہے ، ان کو کرنے کے بعد نتیجہ یہ نکلنا چاہیے کہ ہمارا نفس یا دور جدید کی اصطلاح میں ہماری شخصیت کو پاکیزہ ہوجانا چاہیے ۔جنت اسی پاکیزگی کا بدلہ ہے ۔ اس بات کو قرآن مجید نے کئی مقامات مثلاً اعلیٰ(14:87)، الشمس(7-10:91)، طہ(75-76:20) اور دیگر کئی مقامات پربھی بیان کیا ہے ۔
ہمارے نفس کے کچھ مسائل
تاہم نفس انسانی کی یہ پاکیزگی، اسے بہتر بنانے کا عمل، شخصیت کی بہتری اور اس میں ارتقا، اپنی کمزوریوں اور خامیوں پر قابو، اچھی عادتوں اور رویوں کا اختیار کرنا کوئی سادہ بات نہیں ہے ۔ یہ اس روئے ارض پر کیا جانے والا مشکل ترین کام ہے ۔ یہ کام اتنا مشکل ہے کہ ہر دور میں لوگوں نے اس مشکل کام کو چھوڑ کر مذہب کے نام پر بہت سے ایسے کام کرنا شروع کر دیے جو دیکھنے میں بظاہر مشکل ہیں لیکن کچھ عرصہ کی عادت اور کوشش کے بعد بہت آسان ہوجاتے ہیں ۔ تاہم اس مضمون کا مقصد مذہب کے نام پر کیے گئے ان انحرافات پر گفتگو کرنا نہیں بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ جو کام قرآن مجید بتاتا ہے یعنی اپنے نفس کو پاکیزہ بنانا وہ کتنا مشکل کام ہے ۔ یہ لمحہ لمحہ کی وہ جنگ ہے جو ساری زندگی لڑ نی پڑ تی ہے اور اور موت تک کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ اپنے نفس یا شخصیت کو پاکیزہ بنا چکا ہے ۔ اس حقیقت کو سمجھانے کے لیے ضروری ہے کہ انسانی شخصیت کاتجزیہ کر کے یہ دیکھا جائے کہ یہ کیا ہے ، کس طرح تشکیل پاتی ہے اور تزکیہ نفس کی راہ میں خود ہمارا نفس کس طرح مزاحم ہوجاتا ہے ۔
نفس انسانی کے تشکیلی عناصر
انسان اس دنیا میں جوانی کے عالم میں قدم نہیں رکھتانہ وہ ایک روز اچانک اس زمین پر آسمان سے نازل ہوجاتا ہے ۔ انسان ایک بہت چھوٹے اور معصوم سے بچے کی شکل میں اپنے ماں باپ کے ہاں جنم لیتا ہے ۔اس میں کوئی شک نہیں یہ کہ معصوم انسان ایک فطرت صالحہ لے کر اس دنیا میں آتا ہے ۔ مگراس سے کہیں زیادہ مضبوط اور فعال عناصر انسانی شخصیت کی تشکیل اپنے اپنے طریقے پر کرتے ہیں ۔
ان میں سب سے پہلا اور بنیادی عنصریہ ہے کہ انسان جس طرح اپنے ماں باپ اور دیگر قریبی رشتہ دارو ں کی جنیاتی ساخت وراثت میں لے کر آتا ہے ، اسی طرح ان کی شخصیت، مزاج اور طبیعت کا بھی ایک عکس اپنے اندر لے کر پیدا ہوتا ہے ۔ یہ بات تو سب جانتے ہیں کہ نیاپیدا ہونے والا بچہ یا بچی شکل و صورت میں ماں ، باپ اور دیگر قریبی رشتہ داروں کے مشابہ ہوتا ہے ۔ یہ مشابہت کبھی کسی ایک شخص کی ہوتی ہے اور کبھی ایک سے زیادہ لوگوں کے اثرات کم یا زیادہ اس پر نظر آتے ہیں ۔ مثلاً ناک اور آنکھیں ماں کی ہیں تو رنگ باپ پر چلا گیا ہے ۔ قدو قامت دادا کا ہے تو شکل پر چچا یا ماموں کے اثرات نمایاں ہوجاتے ہیں ۔
ٹھیک یہی معاملہ انسان کی طبیعت اور مزاج کا ہوتا ہے ۔باپ میں اگر بہت غصہ ہوتا ہے تو چار پانچ بچوں میں سے کسی ایک میں یہی چیز نمایاں ہوجاتی ہے ۔ ماں اگر بہت دھیمے مزاج کی ہے تو کوئی نہ کوئی بچہ مزاج کا یہ رنگ اپنے اندر ضرور رکھتا ہے ۔ مگر ضروری نہیں کہ بڑ ے ہونے پر بعینہ بچہ اس مزاج میں ڈھلا ہوا نظر آئے ۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ اثر ایک حد تک ہی ہوتا ہے اور لوگ مزاج میں کاربن کاپی نہیں ہوا کرتے ۔ دوسرے یہ کہ وراثت سے ملنے والے ان اثرات کے علاوہ بھی بہرحال دیگر عوامل شخصیت کی تشکیل کرتے ہیں ۔یہ ممکن ہے کہ ان عوامل کی وجہ سے مزاج پر وراثت کے اثرات کچھ کم

ہوجائیں لیکن یہ بہرحال ہوتے ضرور ہیں ۔
ماحول اور وراثت کے اثرات
وراثت سے کہیں زیادہ بڑ ھ کر انسان کی صورت گری اس کا ماحول کرتا ہے ۔ وراثت کی طرح یہ ماحول بھی انسان کو اس کی مرضی کے بغیر ابتداء ہی سے خود بخود مل جاتا ہے ۔یہ ماحول انسان کا گھر اور گھر والے ، رشتہ دار، محلے والے ، اساتذہ، دوست، رفقاء اور آج کل کے دور میں ٹی وی اور میڈیا بھی فراہم کرتے ہیں ۔
ایک چھوٹا بچہ زبان یہاں سے سیکھتا ہے ۔ کھانے پینے کی عادات یہاں سے اخذ کرتا ہے ۔سونے جاگنے کے اوقات یہاں سے متعین کرتا ہے ۔ ملنے جلنے کے طریقے ، لب و لہجہ، رسوم و رواج یہا ں سے لیتا ہے ۔یہ ساری چیزیں ضروری نہیں کہ انسان کو باقاعدہ سکھائی جائیں ۔ ماحول خود سب سے بڑ ا استاد ہوتا ہے ۔ یہ وہ مدرسہ ہے جس کا نصاب تقدیر طے کرتی ہے ۔ یہ ایک خاندان کے ہر فرد کے لیے بہت مختلف ہو سکتا ہے ۔ مگر ہر انسان چاہے نہ چاہے اس مدرسے کا طالب علم بننے پر مجبور ہے اور وہ وہی کچھ بن کر نکلتا ہے جو یہ مدرسہ اسے غیر نصابی اور غیر رسمی انداز میں سکھاتا ہے ۔ یہ مدرسہ چھوٹی عمر ہی نہیں بلکہ بڑ ی عمر تک انسان پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے اورغیر شعوری طور پر انسان مجبور ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو اس ماحول کے مطابق ڈھالتا رہے جو اس کی تقدیر اس کے لیے طے کر چکی ہے ۔
فطرت ، وراثت اور ماحول کے اثرات اپنی جگہ مگرا نسانی شخصیت کی تشکیل میں اہم ترین کردار تعلیم و تربیت کا ہوتا ہے ۔ ماحول کے برعکس جو غیر شعور ی اور غیر رسمی طور پر بچے کی شخصیت میں اپنا حصہ ڈالتا ہے ، تعلیم و تربیت پورے شعور سے اور رسمی طور پر اس لیے دی جاتی ہے کہ ماں باپ اور معاشرہ یہ چاہتے ہیں کہ بچہ ان کی اقدار اور روایات کے مطابق ان کے خاندان اور سماج کا حصہ بنے ۔
یہ بات ایک منطقی حقیقت ہے کہ عام حالات میں تربیت وہی ہوتی ہے جس طرح کا ماحول انسان کو ملا ہوتا ہے ۔تاہم والدین اور معاشرے اگر چاہیں تو تعلیم اور تربیت اتنی مضبوط اور فیصلہ کن قوت ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ بچے پر ماحول اور وراثت کے تما م اثرات کو مٹا کر اس کی شخصیت کو ایک نئے سانچے میں ڈھال سکتے ہیں ۔
بچے میں اگر غصے کی عادت ہے تو اس کو تربیت سے یہ سکھایا جا سکتا ہے کہ اس پر قابو کیسے پایا جائے ۔ بچے کے ماحول نے اگر اس کے انداز گفتگو میں بدتمیزی کا عنصر پیدا کر دیا ہے تو تربیت اس کو با ادب اور تمیزدار بنا سکتی ہے ۔ یہی تربیت کی اصل اہمیت ہے کہ یہ انسانی شخصیت کی تشکیل کے عمل کو جس رخ پر چاہے موڑ سکتی ہے ۔
انسانی آزمائش
اوپر کی یہ گفتگو اگر واضح ہے کہ بچے کی شخصیت کی تشکیل میں وراثت، ماحول اور تعلیم و تربیت کا کیا کردار ہوتا ہے تو اب یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ ان عوامل کی بنیاد پر انسان سن شعور میں قدم رکھنے سے قبل جو کچھ بننا ہوتا ہے ، بن چکا ہوتا ہے ۔ پندرہ سترہ برس کی جس عمر میں انسان آزادانہ طور پر سوچنے اور فیصلہ کرنے کے قابل ہوتا ہے ، اس کی شخصیت اس عمر تک پہنچنے سے پہلے ہی ان عوامل کے تحت ایک خاص رخ اختیار کر چکی ہوتی ہے ۔انسا ن اپنے ماضی کا قیدی ہو چکا ہوتا ہے ۔ اب اس کے بعد وہ خود کو جتنا چاہے آزاد سمجھے ، خود مختار خیال کرے ، خودکواپنی زندگی کا مالک جانے ؛ وہ درحقیت اپنے اس مزاج اور طبیعت کا اسیر ہوتا ہے جس کی تشکیل اس کی وراثت، ماحول اور تربیت بہت پہلے کر چکی ہوتی ہیں ۔لوگ خوش اخلاق ہوں یا بداخلاق، نرم مزاج ہوں یا غصیلے ، جلد باز ہو ں یا تحمل مزاج، سخی ہوں یا کنجوس، خود غرض ہو ں یا بے لوث، بہادر ہوں یا بزدل؛ وہ جو بھی ہوں اپنے ماضی کا ایک عکس ہوتے ہیں ۔
دیکھنے میں یہ بات ایک انسانی المیہ لگتی ہے ، مگر یہ انسانی المیہ نہیں آزمائش ہے ۔خالق کائنات کا انسان کے بارے میں فیصلہ یہی ہے کہ وہ جب سن شعور کو پہنچے گا تو بہرحال اس کی شخصیت ایک خاص رخ پر ڈھل چکی ہو گی۔ مگر رب کریم چونکہ بہت مہربان ہے اس لیے اس نے انسانوں کو دو ایسی بھرپور صلاحیتیں دی ہیں جن کی مدد سے وہ باآسانی اس آزمائش سے سرخرو ہوکر نکل سکتا ہے ۔
ان میں سے پہلی صلاحیت عقل و فہم کی وہ صلاحیت ہے انسان کی طرح جو روئے ارض پر کسی اور

مخلوق کو حاصل نہیں ۔دوسری صلاحیت قوت ارادی اور اپنا فیصلہ نافذ کرنے کی طاقت ہے ۔ یہ وہ دو صلاحیتیں ہیں جن کے بل بوتے پر انسا ن نے ہر دور میں دنیا پر راج کیا ہے اور آج وہ فطرت کی تمام قوتوں کو مسخر کر چکا ہے ۔وہ زمین پر ہر جاندار سے زیادہ تیز رفتری سے سفر کرتا ، ہوا میں اڑ تا ، سمندر کا سینہ چیر کر اپنی منزل تک پہنچتا اور اب تو خلا عبور کر کے دیگر سیاروں پر بھی کمند ڈال رہا ہے ۔ انسان ان دوچیزوں کو استعمال کر لے تو وہ اپنی شخصیت کی تشکیل نوکر کے اسے اس سانچے میں ڈھال سکتا ہے جو اللہ کو پسند ہے اور جسے قرآن مجید تزکیہ نفس کہتا ہے ۔

انسانی المیہ

تاہم یہ بڑ ا المیہ ہے کہ اکثر و بیشتر انسان سرے سے اپنی اس آزمائش سے واقف ہی نہیں ہیں ۔دوسروں کوچھوڑ یے خود مسلمان کہلانے اور سمجھنے والے لوگ حتیٰ کہ ان کے بہت سے علماء اس حقیقت کو نہیں سمجھتے کہ اس دنیا میں آنے کے بعد جو اصل جنگ لڑ ی جانی ہے اور جس پر نجات موقوف ہے وہ اپنی اس شخصیت کے خلاف لڑ نا ہے جس کی تشکیل ابتدائی برسوں میں ہوگئی ہے اور جس کو نئے سرے سے تعمیر کرنا اصل دین ہے ۔ دین کے سارے مطالبات اسی مرکزی خیال کے اردگرد گھومتے ہیں ۔
اس سے زیادہ بڑ ا المیہ یہ ہے کہ خالق کائنات نے اسے اس آزمائش سے نمٹنے کے لیے اور اپنی شخصیت کی تشکیل نو کے لیے جو غیر معمولی ہتھیار عطا کیے ہیں یعنی عقل و بصیرت اور قوت ارادی ، انسان ان دونوں ہتھیاروں کو اپنی شخصیت کے خلاف استعمال کر کے اس کی تعمیر نو کرنے کے بجائے جو کچھ غلط صحیح گھروندا بن چکا ہے ان ہتھیاروں کو اس گھروندے کی حفاظت پر مامور کر دیتا ہے ۔
وحی اترتی ہے اور انسانوں کو یہ بتاتی ہے کہ دیکھو تمھارے آبا ء اجداد اور ماحول کے اثر سے تمھارے عقائد ، نظریات اور خیالات غلط ہو چکے ہیں ۔ ہم عقلی طور پر تمھیں قائل کر دیتے ہیں ، اس کے بعد تم قوت ارادی استعمال کر کے خود کو بدلو۔ مگر لوگ یہ بات کہنے والے کے پیچھے لگ جاتے ہیں ۔ اپنی عقل کو بات سمجھنے کے بجائے مخالفت اور قوت ارادی اور تمام تر عملی صلاحیتوں کو داعی حق کے خلاف استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں ۔پیغمبر کھڑ ے ہوکر بتاتے ہیں کہ تمھاری اقدار غلط ہیں ، تمھارے اخلاق آلودہ ہیں ، تمھاری روایات اصل دین سے انحراف ہیں ، مگر لوگ ان کی بات سننے اور سمجھنے کے بجائے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر پتھروں کی طرح اپنے عمل پر جم جاتے ہیں ۔

ایمانی رویہ

تاہم اس کے برعکس ایک دوسرا رویہ یہ ہوتا ہے کہ لوگ اپنی وراثت، ماحول اور تربیت کے اثرات کو ایک کونے میں رکھ کر سنجیدگی کے ساتھ سوچتے ہیں کہ کیا یہ بات ٹھیک ہے ۔ ان کی عقل بتاتی ہے کہ یہ بات واقعی ٹھیک ہے ۔ ان کی فطرت جو سب سے نیچے دبی ہوئی ہوتی ہے ، دوبارہ ابھر کر سامنے آتی ہے اور اس بات کی تائید کر دیتی ہے ۔ جس کے بعد وہ اپنی قوت ارادی کو استعمال کرتے ہیں اور اپنی شخصیت کی تعمیر نو کا عزم کرتے ہیں ۔ پہلے مرحلے پر وہ اپنے اعتقادات اور نظریات کا جائزہ لیتے ہیں اور ماضی کے ہر غلط تصوراور اعتقاد سے پیچھا چھڑ ا کر نئی بات قبول کرتے ہیں ۔ یہ ایمان لانے کا عمل ہے ۔ اس کے بعد وہ اپنی شخصیت کو ان تقاضوں کے مطابق ڈھالنا شروع کرتے ہیں جن کا مطالبہ کیا جاتا ہے ۔ یہ عمل صالح ہے ۔ ایمان و عمل صالح کا یہ عمل اپنے نتیجے کے اعتبار سے شخصیت کی تعمیر نوکا عمل ہے ۔ یہ زندگی بھر کے بنے بنائے ڈھانچے کو گرا کر نئے سرے سے تعمیر کرنے کا وہ کام ہے جسے قرآن تزکیہ نفس کہتا ہے ۔

ہمارا کام

تزکیہ نفس کا یہ عمل ہم میں سے ہر شخص پر فرض ہے ۔ اس کے بغیر جنت میں داخلہ ممکن نہیں ۔ آج بھی ہمیں اپنی وراثت، ماحول اور تربیت سے بننے والی شخصیت کا جائزہ لینا ہو گا۔ اپنے تعصبات ، عادات، خواہشات اور ترجیحات کو قرآن و سنت کی روشنی میں دیکھنا ہو گا۔ اپنے ماضی کو مقدس سمجھ کر اس سے چمٹے رہنے کے بجائے اس کا تنقیدی جائزہ لینا ہو گا۔ جو شخص کوئی بات بتائے اس سے متوحش ہونے کے بجائے اس کی بات سننی ہو گی۔ اپنے رویوں کی اصلاح کا عزم کرنا ہو گا۔ اس روش کے بغیر جنت کے جتنے خواب چاہے ہم دیکھ لیں ، ہم میں اور ایک یہودی، عیسائی اور ہندوؤں میں اصلاً کوئی فرق نہیں ۔ ہم بھی جہاں بیٹھ گئے ، جو سن لیا اور جو بن گئے اگر اسی پر جمے رہے تو ہم میں اور ایک غیر مسلم میں پھر

کوئی فرق نہیں ۔پھر اسے جہنم میں پھینکنا اورہمیں جنت میں بھیجنا ایک ایسی نا انصافی ہے جو عالم کا پرودگار کبھی نہیں کرسکتا۔
تاہم یہ اہم سوال ابھی باقی ہے کہ برسوں کی بنی بنائی شخصیت کو توڑ کر نئے رویوں میں کیسے ڈھالا جائے ۔ اس پر انشاء اللہ آئندہ بات ہو گی۔جہاں رہیں بندگان خدا کے لیے باعث رحمت بنیے ، باعث آزار نہ بنیے ۔

جاوید چودھری
خوشحالی کے چھ اصول

وارن بفٹ دنیا کے نامور سرمایہ کار ہیں ، یہ امریکا کے شہر اوماہا میں رہتے ہیں ، یہ امریکا کی 9 بڑ ی کمپنیوں کے چیئر مین ، سی ای او یا سربراہ ہیں ، یہ 2000 ء سے دنیا کے دس امیر ترین لوگوں کی فہرست میں آ رہے ہیں ، یہ غریب والدین کی اولاد تھے ، سرمایہ کاری جینز میں تھی، بچپن میں بچوں کو کوکا کولا کی بوتلیں سپلائی کرنا شروع کیں اور پھر کبھی مڑ کر نہیں دیکھا، یہ اس وقت 74 بلین ڈالر کے مالک ہیں لیکن دولت کے باوجود سادہ زندگی گزارتے ہیں ، یہ پانچ کمروں کے پرانے گھر میں رہتے ہیں ، یہ گھر انہوں نے 1958ء میں خریدا تھا، یہ گھر کا سارا کام خود کرتے ہیں ، گھر کے سامنے ایک چھوٹی سی کافی شاپ ہے ، صدر اوبامہ ہوں ، بل گیٹس ہوں یا پھر کسی دوسرے ملک کا سربراہ، کاروباری شخصیت یا راک سٹار جو بھی شخص وارن بفٹ سے ملنا چاہتا ہے وہ ان سے وقت طے کرتا ہے اور اس کافی شاپ میں آ جاتا ہے ، وارن بفٹ طے شدہ وقت پر یہاں آتے ہیں ، اس شخص سے ملاقات کرتے ہیں اور وقت ختم ہونے پر وہاں سے اٹھ کر چلے جاتے ہیں ، یہ اس وقت امریکا اور دنیا میں دو تحریکیں بھی چلا رہے ہیں ، یہ دنیا میں ایسے ایک سو ارب پتی لوگو ں کا کلب بنانا چاہتے ہیں جس کے تمام ممبرز انتقال سے قبل اپنی تین چوتھائی دولت خیرات کر دیں ، یہ دولت دنیا بھر میں فلاح عامہ ، صحت تعلیم اور ریسرچ پر خرچ ہو، یہ ہر سال بل گیٹس کی ’’بل اینڈ ملینڈا گیٹس فاؤنڈیشن‘‘ کو خیرات دیتے ہیں ، وارن بفٹ نے 2014ء میں 2.8 بلین ڈالر بل گیٹس کی فاؤنڈیشن کو دئیے ، یہ امریکا میں ’’امیر لوگوں کو زیادہ ٹیکس دینا چاہیے ‘‘ جیسی تحریک بھی چلا رہے ہیں ، امریکا میں سرمایہ کاروں کو ٹیکس مراعات حاصل ہیں ، وارن بفٹ ان مراعات کے خلاف ہیں ، یہ کہتے ہیں میرے منیجر میرے مقابلے میں زیادہ ٹیکس دیتے ہیں ، یہ معاشرے کے ساتھ ظلم ہے ، حکومت کو امیروں پر ٹیکس بڑ ھانا چاہیے اور غریبوں پر ٹیکس کا بوجھ کم کرنا چاہیے ، وارن بفٹ دنیا کے ان چند لوگوں میں بھی شمار ہوتے ہیں جنہوں نے انسانی ذہن کو بے تحاشہ متاثر کیا ، یہ صوفی منش انسان ہیں ، آپ صوفیاء کرام کے طرز زندگی کا مطالعہ کریں اور اس کے بعد وارن بفٹ کے شب و روز کا تجزیہ کریں تو آپ کو دونوں میں بے شمار مشترک عادتیں ملیں گی، یہ ارب پتی ہونے کے باوجود ذہنی، روحانی اور جسمانی لحاظ سے صوفی ہیں ، یہ ٹینشن فری زندگی گزارتے ہیں ، ذاتی زندگی میں کنجوس ہیں ، خوراک، کپڑ وں اور گاڑ یوں پر رقم ضائع نہیں کرتے ، یہ تعیشات سے بھی پاک ہیں ، نمود و نمائش کے خلاف ہیں ، دولت کے اصراف کو گناہ سمجھتے ہیں ، ریستورانوں سے صرف اتنا کھانا خریدتے ہیں جتنی انہیں ضرورت ہوتی ہے لیکن ضرورت مندوں کے لیے ان کا دل انتہائی کھلا ہے ، آپ پورے عالم اسلام سے کوئی ایک ایسا رئیس شخص دکھا دیجئے جو ہر سال اربوں ڈالر چیریٹی کرتا ہو جبکہ وارن بفٹ ہر سال یہ کرتے ہیں ، یہ چیریٹی کرتے وقت مذہب نسل اور ملک سے بالاتر ہو جاتے ہیں ، ان کی دولت دنیا کے 245 ممالک کے ضرورت مندوں کے کام آتی ہے اور یہ ان کے انتقال کے بعد بھی کام آئے گی مگریہ دولت اور ان کا طرز زندگی ہمارا موضوع نہیں ، ہمارا موضوع سرمایہ کاری اور دولت کے بارے میں ان کا فلسفہ حیات ہے ۔
وارن بفٹ نے نئے سرمایہ کاروں ، خوش حال زندگی گزارنے کے خواہش مند مڈل کلاسیوں اور آمدنی میں اضافے کے متمنی لوگوں کے لیے چھ اصول وضع کیے ہیں ، یہ چھ اصول وارن بفٹ کی کامیابی کے گُر ہیں ، یہ گُردنیا کے عظیم سرمایہ کار فلاسفر کی کاروباری زندگی کا نچوڑ ہیں ، میں یہ نچوڑ آپ کے سامنے

رکھنا چاہتا ہوں ، آپ اگر تھوڑ ی سی توجہ دیں تو یہ گُر آپ کی زندگی میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں ،
وارن بفٹ کا پہلا گُر آمدنی سے متعلق ہے ، ان کا کہنا ہے ، انسان کو کبھی ایک ذریعہ معاش پر انحصار نہیں
کرنا چاہیے ، اس کا کوئی نہ کوئی دوسرا ''سورس آف انکم'' ضرور ہونا چاہیے ، میں وارن بفٹ کے اس
نقطے سے اتفاق کرتا ہوں ، دنیا میں ہر وہ شخص معاشی دباؤ کا شکار رہتا ہے جس کی آمدنی کا ذریعہ ایک
ہوتا ہے ، آپ نوکری کرتے ہوں یا کاروبار آپ روزانہ اتار چڑ ھاؤ سے گزرتے ہیں ، دنیا میں کوئی نوکری ،
کوئی کاروبار مستقل نہیں ہوتا چنانچہ آپ جب بھی کسی ایک ذریعے پر انحصار کریں گے تو آپ پر دباؤ
ضرور آئے گا چنانچہ آپ کو آمدنی کے دو سے تین مختلف ذرائع پیدا کرنے چاہئیں ، آپ اگر میاں بیوی ہیں تو
آپ دونوں کو کام کرنا چاہیے اور دونوں کاکام مختلف ہونا چاہیے تا کہ اگر کسی ایک کا کام یا جاب ختم ہو
جائے تو گھر چلتا رہے ، دنیا کا بہتر ماڈل کام ، بزنس اور سرمایہ کاری ہے یعنی اگر گھر کا ایک فرد جاب
کرتا ہے تو دوسرے کو کاروبار کرنا چاہیے اور یہ دونوں جو کما رہے ہیں اس کا ایک حصہ سرمایہ کاری
میں لگنا چاہیے ۔ یہ سرمایہ کاری آپ کے گھر کے اخراجات میں سہولت پیدا کر دے گی تاہم آپ خواہ ارب
پتی ہی کیوں نہ ہوں آپ کی آمدنی کا ذریعہ ایک نہیں ہونا چاہیے ، آپ کے دو یا تین سورس آف انکم ہونے
چاہئیں ، آپ بلا ضرورت رقم خرچ نہ کریں ، وارن بفٹ مثال دیتے ہیں ، میں بے شمار ایسے لوگوں سے
واقف ہوں جو بلا ضرورت اشیاء خریدنے کی عادت میں مبتلا تھے لیکن انہیں بعد ازاں اپنی ضرورت پوری
کرنے کے لیے ایسی اشیاء بیچنا پڑ یں جو ان کے لیے انتہائی ضروری اور اہم تھیں ، میں وارن بفٹ کی اس
بات سے بھی اتفاق کرتا ہوں ، ہم جب بھی کوئی چیز خریدیں ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال ضرور پوچھنا
چاہیے ، کہ کیا یہ چیز میرے لیے ضروری ہے یا میں اس چیز کے بغیر بھی گزارہ کر سکتا ہوں ؟ ہمیں ان
سوالوں کے جواب کے بعد خرید و فروخت کا فیصلہ کرنا چاہیے ۔ہم یہ عادت اپنا لیں گے تو ہمارے معاشی
دباؤ میں کمی آجائے گی، وارن بفٹ کا تیسرا اصول بچت سے متعلق ہے ، وارن بفٹ کا کہنا ہے ، دنیا کے
زیادہ تر لوگ اخراجات سے بچنے والی رقم کو بچت سمجھتے ہیں ، یہ تصور غلط ہے ، انسان کو چاہیے یہ
اسے بچت نہ سمجھے جو خرچ کرنے کے بعد باقی بچ جائے بلکہ اسے وہ خرچ کرنا چاہیے جو بچت کے بعد
باقی بچ جائے ۔یہ کہتے ہیں آپ عملی زندگی میں داخل ہوتے ہی یہ فیصلہ کر لیں آپ اپنی آمدنی کا اتنے فیصد
بچائیں گے ، آپ کے ہاتھ میں جوں ہی رقم آئے آپ سب سے پہلے اس میں سے بچت الگ کریں اور باقی رقم
اس کے بعد خرچ کریں ، آپ پوری زندگی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلائیں گے ، یہ فارمولا بھی پریکٹیکل
اور کامیاب ہے ، آپ آج سے اس پر عمل شروع کر یں ، آپ تین ماہ میں اس کے نتائج دیکھیں گے ۔وارن بفٹ
کا چوتھا اصول سرمایہ کاری سے متعلق ہے ، یہ اپنی پوری سرمایہ کار زندگی کو صرف ایک فقرے میں
بیان کرتے ہیں ، یہ کہتے ہیں '' میں نے کبھی اپنے تمام انڈے ایک ٹوکری میں نہیں رکھے '' یہ کہتے ہیں ،
آپ اپنی بچت کو کبھی کسی ایک سیکٹر میں نہ لگائیں کیونکہ اگر یہ شعبہ بیٹھ گیا تو آپ کی ساری سرمایہ
کاری پھنس جائے گی، آپ آٹھ سے دس شعبوں کی فہرست بنائیں اور اپنی بچت ان تمام شعبوں میں پھیلا دیں ،
آپ کو کبھی گھاٹا نہیں پڑ ے گا، وارن بفٹ کا پانچواں اصول رسک سے متعلق ہے ، یہ کہتے ہیں لوگ
دریاؤں میں اندھا دھند چھلانگ لگانے کو رسک کہتے ہیں جبکہ یہ رسک رسک نہیں خود کشی ہوتی ہے ،
آپ دریا کو دریا سمجھیں ، اسے خطرناک جانیں ، آپ کبھی اس کی گہرائی ماپنے کے لیے اس میں پاؤں نہ
ڈالیں ، وارن بفٹ کا یہ نقطہ خاصا مشکل ہے ، یہ شاید اس اصول کے ذریعے یہ سمجھانا چاہتے ہیں ، انسان
کو اپنی غلطیوں سے سیکھنے کی بجائے دوسروں کی غلطیوں سے سیکھنا چاہیے ، آپ خود رسک لینے کی
بجائے دوسروں کے رسک سے سیکھیں ، آپ دریا کی گہرائی ماپنے کے لیے خود دریا میں نہ اتریں ، آپ
دریا کے کنارے نصب بورڈ پڑ ھ لیں یا پھر دریا کے کسی ماہر سے پوچھ لیں ، یہ بتانا چاہتے ہیں ہمیں زندگی
میں رسک لینے سے قبل باقاعدہ ریسرچ کرنی چاہیے ، لوگوں سے مشورہ کرنا چاہیے اور کثرت رائے سے
فیصلہ کرنا چاہیے اور وارن بفٹ کا چھٹا اور آخری اصول توقعات سے متعلق ہے ، یہ کہتے ہیں ، ایمانداری
قیمتی تحفہ ہے ، آپ سستے لوگوں سے اس کی توقع نہ رکھیں ، میں وارن بفٹ کی اس بات سے بھی اتفاق
کرتا ہوں ۔ ہم اعتماد کی وجہ سے 80 فیصددھوکے کھاتے ہیں ، آپ لوگوں پر اندھے اعتماد کی بجائے سوچ
سمجھ کر فیصلے کریں ، آپ 80 فیصد دھوکوں سے بچ جائیں گے ، ہم سرمایہ کاری کے لیے ہمیشہ دوسروں
پر اعتماد کرتے ہیں ، ہم لوگوں کو ظاہری حلئے کی بنیاد پر ایماندار یا بے ایمان سمجھ بیٹھتے ہیں اور یہاں

سے ہمارے معاشی مسائل شروع ہو جاتے ہیں ، آپ دوسروں پر اندھے اعتماد کی بجائے ٹھوک بجا کر سرمایہ کاری کریں ، اپنی تسلی کریں ، کاغذی کار روائی مکمل کریں اور وقت پر قسطیں ادا کریں ، آپ کو کبھی شرمندگی یا پریشانی نہیں ہو گی۔
وارن بفٹ کے یہ چھ اصول صرف فلسفہ نہیں ہیں ، یہ ان کی عمر بھر کے تجربات کی کمائی ہیں ، یہ وہ اصول ہیں جنہوں نے معمولی غریب انسان کو دنیا کا دوسرا امیر ترین شخص بنایا، ہم اگر ان اصولوں کو رہنما مان لیں تو ہم ارب پتی نہ بھی بنیں تو بھی ہم ایک خوش حال زندگی ضرور گزار سکتے ہیں ، باقی آپ خود سمجھ دار ہیں ۔

پروفیسر محمدعقیل

اچھی اور بری صحبت

صحبت سے انسان بنتا بھی ہے اور بگڑ تا بھی۔ مشہور مقولہ ہے کہ کوئلہ بیچنے والے کی صحبت کالک اور دھبے تحفے میں دیتی ہے جبکہ عطر فروش کی دوستی وجود کو معطر کر دیتی ہے ۔مثال کے طور پر ایک شخص چرسیوں میں اٹھنا بیٹھناشروع کر دے تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ وہ ان جیسا ہی ہوجائے گا ۔ اسی طرح اگر کوئی نمازی نمازی لوگوں کی دوستی اختیار کر لے تو امید ہے کہ وہ بھی نماز کی جانب مائل ہوجائے گا۔
پہلے صحبت کا مطلب لوگوں سے بالمشافہ ملاقات سمجھی جاتی تھی۔لیکن آج کل کے دور میں صحبت کے معنی بدل گئے ہیں ۔ اب یہ میل جول ای میل، چیٹنگ، فیس بک، ٹوئیٹر، ا سکائپ اور دیگر ٹولز کے ذریعے انٹرنیٹ پر کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح موبائل پر بات چیت، ایس ایم ایس، ایم ایم ایس اور دیگر ذرائع بھی صوتی ملاقات کے ذرائع ہیں ۔
ان کے علاوہ ایک اور طرح کی صحبت ہے جو یکطرفہ کہلائی جا سکتی ہے ۔ اس میں ٹی وی پروگرامز، ایف ایم ریڈیو، ڈی وی ڈی مو ویز، انٹرنیٹ کی ویب سائیٹس ، بلاگز، اخبارات و رسائل وغیرہ شامل ہیں ۔ آج لوگ ان کی صحبت میں اپنے وقت کا بڑ ا حصہ صرف کرتے ہیں ۔
صحبت خواہ وہ بالمشافہ ہو یا کسی اور ذریعے سے ، ہر صورت میں اس کا اثر شخصیت پر پڑ تا ہے ۔
چنانچہ انٹرنیٹ پر فحش ویب سائٹس کی صحبت میں رہنے والے کا رویہ ایک جارحانہ اور جنسی پژمردگی پر مبنی ہو گا۔ دوسری جانب قرآن کا ترجمہ و تفسیر سننے والا شخص خدا کی بندگی کے زیادہ قریب ہو گا۔
صحبت کی اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے اسے براہ راست موضو ع بنایا اور ہدایت کی کہ راست باز، نیک اور صالح صحبت اختیار کی جائے ۔ جیسا کہ اس آیت میں بیا ن ہوتا ہے :
اے اہل ایمان! خدا سے ڈرتے رہو اور راستبازوں کے ساتھ رہو۔(التوبہ 119:9))
دوسری جانب جو لوگ خود کو بری صحبت سے نہیں بچا پاتے اس کا بھی ایک تمثیلی نقشہ قرآن نے کچھ اس طرح کھینچاہے :
(جنت میں)یہ لوگ بھی ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو کر سوال کریں گے ۔ ان میں سے ایک (جنتی)کہے گا:
"(دنیا میں) میرا ایک ہم نشین تھا۔ جو مجھے کہا کرتا تھا: ’’کیا تم بھی ایمان لانے والوں میں شامل ہوگئے ہو؟ بھلا جب ہم مر کر مٹی اور ہڈیاں بن جائیں گے تو کیا ہمیں سزا و جزا بھگتنا پڑ ے گی؟‘‘
پھر وہ (جنتی دوسرے جنتی سے)کہے گا: ’’کیا تم اس (ورغلانے والے)کا حال معلوم کرنا چاہتے ہو؟‘‘ پھر جب وہ (جنتی اس کا حال معلوم کرنے کے لئے جہنم میں)جھانکے گا تو اسے جہنم کے عین درمیان دیکھے گا۔
پھر(وہ جنتی)کہہ اٹھے گا:۔ ’’اللہ کی قسم! تم مجھے ہلاک کر کے ہی چھوڑ تے ۔ اور اگر مجھ پر میرے اللہ کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی (مجرموں کی طرح جہنم میں)حاضر کئے ہوئے لوگوں میں شامل ہوتا‘‘۔(الصافات: آیات 50-57)

ان آیات میں واضح طور پر یہ بتادیا گیا کہ بری صحبت کا انجام جہنم کا گڑ ھا بھی ہو سکتا ہے ۔اچھی اور بری صحبت کے فرق کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت اچھی مثال سے سمجھایا ہے :
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اچھے اور برے ساتھی کی مثال ایسی ہے جیسے مشک والا اور لوہاروں کی بھٹی تو مشک والے کے پاس سے تم بغیر فائدے کے واپس نہ ہو گے یا تو اسے خریدو گے یا اس کی خوشبو پاؤ گے اور لوہار کی بھٹی تیرے جسم کو یا تو تمہارے کپڑ ے کو جلادے گی یا تم اس کی بدبو سونگھو گے ۔(صحیح بخاری:جلد اول:حدیث نمبر 2021)
چنانچہ ہمیں جائزہ لینا چاہئے کہ ہم کس قسم کی صحبت میں اپنا وقت گذارتے ہیں ۔ اگر یہ وقت ٹی وی کے بے اخلاق پروگرامز، دنیا پرستی پر مبنی فلمیں ، عریاں ویب سائیٹس، گندے لطیفوں پر مبنی ایس ایم ایس، تحقیر آمیز مذاق پر مبنی ای میلز ، فیس بک کی لایعنی پوسٹس اور دنیا پرستی کی ہوا دینے والے رسالوں کے ساتھ گذرتا ہے تو اس بری صحبت کا نتیجہ آلودہ شخصیت کا حصول ہے ۔ دوسری جانب اگر ہمارے ساتھی قرآن کی تفسیر و تلاوت، پاکیزہ ای میلز، ستھرے ایس ایم ایس، ایمان افروز پوسٹس، ایمان سنوارنے والے پروگرامز اور نفس کی تربیت کرنے والی محفلیں ہیں تو اس اچھی صحبت کا آوٹ پٹ ایک پاکیزہ شخصیت ہے ۔ ناپاک شخصیات کا ٹھکانہ جہنم کی آگ اور پاکیزہ نفوس کا مقام جنت کے باغات ہیں ۔ اب فیصلہ ہمارے ہاتھ میں ہے کہ ہم کہاں جانا چاہتے ہیں ۔

فرح رضوان

بچوں کے سوالات

یہ توبالکل ٹھیک ہے کہ ہر معاملے میں بچوں کی شمولیت مناسب نہیں لیکن اب، گھر چھوٹے اور بچے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سیانے ہو چکے ہیں ، تو بجائے اس کے کہ وہ ادھوری باتیں سن کر اس سے بھی آدھی سمجھ کر معاملات کو غلط طور سے لیں ، بہتر ہے کہ جب کبھی بھی، نارمل سے ہٹ کر حالات ہوں تو اس پر بچوں کو اعتماد میں لے کر انہیں زندگی کی اونچ نیچ سے آگاہ کیا جائے تاکہ کل کو عملی زندگی میں بھی یہ سبق ان کے کام آئے ۔ بار بار کی اس پریکٹس سے دوہرے مثبت نتائج کی امید ہے ، ایک تویہ کہ، آپس میں بات چیت کا یہ ماحول اس وقت بھی برقرار رہ پائے گا، جب آپ بوڑ ھے اور بچے مصروف ہو جائیں گے ، دوسرا یہ کہ کوئی بھی الجھن بچے کے ذہن میں ہو تو آپ سے پوچھنے سے نہیں ہچکچائے گا۔اسے یہ اعتماد دینے کے لیے آپ دواصول ضرور اپنالیں ، پہلا یہ کہ بچہ اپنی عمر سے کتنا ہی بڑ ا سوال کر لے ، آپ اسے جھڑ کیں نہیں ، دوسرا یہ کہ کوئی جھوٹی کہانی نہ سنائیں بلکہ نرمی سے صرف اتنا کہہ دیں کہ بیٹا جب آپ بڑ ے ہو جائیں گے تو آپ کو خود پتہ چل جائے گاجھوٹا بہلاوا نہ دینے کی برکت سے ہوتا یہ ہے کہ بچہ ہمیشہ سے اپنے والدین کو جس مقام پر بٹھا کر رکھتا ہے ، حقیقت معلوم ہونے پر اس بلند مقام سے گر کروالدین کا کردار مجروح نہیں ہو پاتا ، لیکن ! ایسا ماحول ممکن اس وقت ہو سکے گا جب کھانے اور ٹی وی کا وقت ایک نہ ہو ۔
ٹی وی بھی اپنی طرز کی ایک بڑ ی آزمائش ہے کہ آپ اپنی تفریح بھی چاہتے ہیں ، بچوں کو بگاڑ سے بھی بچانا چاہتے ہیں ، آپ بہت اصول پسند اور مہذب واقع ہوئے ہیں لہٰذا آپ بچوں کو مو ویز دیکھنے کے لیے PG ریٹنگ دیکھ کر ہی اس کی اجازت مرحمت فرماتے ہیں اور اپنے لیے بڑ وں والی فلم یا شوز کا انتخاب فرماتے ہیں ، لیکن سوال یہ ہے کہ بحثیت مسلمان آپ کو کیا کچھ دیکھنے اور سننے کی اجازت ہے ؟کیونکہ یہ ہو نہیں سکتا کہ آپ بچوں سے چھپ کر اللہ کی بنائی حدود کو پھلانگتے رہیں اور وہ با حیا اور با کردار نکلیں ۔
برگد کا درخت جس طرح یکے بعد دیگرے اپنی ہی جڑ سے پنپتا اور میلوں پھیلتا چلا جاتا ہے ایسے ہی

ہمارے گناہ یا نیکی ہماری اولاد اور پھر نسلوں میں پھیلتی چلی جاتی ہے ، ہمارے آج کے لمحاتی گناہ ، بچوں کے اخلاق و کردار میں ڈھل کر ہمارے لیے گناہ جاریہ اور نہ ختم ہونے والی اذیت بن سکتے ہیں اور آج کی سچی توبہ ، ذرا سا صبر ، تقوی اور نیکی انشاللہ صدقہ جاریہ اور ہمیشہ کی راحت کا سبب بن سکتی ہے
۔کیونکہ ہم بچوں سے تو چھپ سکتے ہیں اللہ تعالیٰ سے نہیں ۔
چھپی ہوئی ایک عادت بھی اکثر والدین میں ہوتی ہے اور ایسی مخفی، کہ انہیں اس کا اندازہ تک نہیں ہو پاتا ، وہ ہے میاں بیوی کی ایک دوسرے سے غاصبانہ محبت ، یعنی اکثر ماں یا باپ میں سے کوئی ایک، دسرے کو اس حد تک چاہتا ہے کہ پھر غیر کیا، خود اپنی اولاد سے ہی رقابت شروع ہو جاتی ہے اور شامت اس بچے کی آتی ہے جو سب سے زیادہ آپ کے spouse سے edattach ہو۔یہ اپنی طرز کا انوکھا اور پیچیدہ ترین love triangle ہوتا ہے جس میں کوئی ولن تو نہیں ہوتا لیکن ایک دوسرے سے شدید محبت کے باوجود کوئی کسی سے خوش بھی نہیں ہوتا، چپکو بچے کی ان کہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے پسندیدہ parent سے چپکا رہے ، اس سے محبت پاتا ، فرمائشیں منواتا، اس کے آ س پاس ہی منڈلاتا رہے جب کہ والدین میں سے وہ ، جو بہت possessive ہے ، اپنے غیر شعوری invisible جذبہ رقابت کے تحت ، اپنی ہی اولاد سے الجھنا، چڑ چڑ انا، بات بات پر خفا ہونا ، ڈانٹنا اور سزا دینا شروع کر دیتا ہے ۔
جب کہ اسی کا رویہ دوسرے بچوں سے ایسا جارحانہ نہیں بلکہ مشفقانہ ہوتا ہے ، تو یہ بچہ، عدم اعتماد ، خودرحمی ، نفرت اور ضد میں مبتلا ہو کر بات بات پر روتا ، اڑ جاتا ، اس پر ڈانٹ کھاتا اور پھر گھٹ کر رہ جاتا ہے ، اور بار بار کا یہی عمل بچوں کی نفسیات کو مسخ اور گھر کے سکون کو برباد کر ڈالتا ہے ۔
اس صورتحال میں بچے کا پسندیدہ parent اس بچے کوcompensate کرنے کی خاطردوسروں کی نسبت رعایتی طرز عمل اختیار کرنا شروع کر دیتا ہے ، یہ بات possessive parent کو بھی کھٹکتی ہے اور باقی بچوں کو بھی تو یوں اس رعایتی طرز عمل کا فائدہ کم اور نقصان بہت ہی زیادہ ہوتا ہے ، کیونکہ تمام ہی بچوں میں رقابت ، نا اتفاقی، عدم اعتماد ، احساس برتری اور کمتری ان کی شخصیات اور عمروں کے لحاظ سے اپنی اپنی جگہ بنانا شروع کر دیتا ہے ، تو چالاک بچے ان حالات کو بھانپ کر manipulate کرنا شروع کر دیتے ہیں ، اور نادان بچے گھر میں گھٹن کا شکار ہو کر غلط دوستوں یا عادتوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں ۔
لہٰذا بچوں کے ایسے ری ایکشنز پر ان کی خبر لینے کے بجائے اپنا کڑ اجائزہ لیجیے ، اور اپنی اصلاح اور ان سے صلح کرنے میں بالکل بھی دیر نہ کیجیے ۔

سفیرالاسلام
تیسرا اصول:آواز کو ہلکا رکھنا

ایک گھر کے افراد سب سے زیادہ قریب کے پڑ وسی ہوتے ہیں ۔ وہ ایک دوسرے سے باہم ملتے رہتے ہیں ۔ قربت میں سب سے بڑ ھ کر ہوتے ہیں ٗ اس بنا پر ان سب کا ایک دوسرے پرسب سے زیادہ حق ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اذیت یا تکلیف نہ دیں ٗ ان میں اہم ترین تکلیف بہت بلند آواز سے بولنا ہے ۔
ایک مسلمان گھرانے کے افراد ایک دوسرے کو اس طرح تکلیف اور اذیت دینے والے نہیں ہوتے ۔ ہم دوسروں کو اذیت میں مبتلا کرنے کی بہت سی مثالیں دے سکتے ہیں ۔مثلاً کوئی اپنے گھر میں ریڈیو، ٹی وی یا ڈیک کو اتنی اونچی آواز سے لگائے کہ کسی دوسرے کو تکلیف ہو یا اسے اچھا محسوس نہ ہو، یہ گھر میں بھی ہو سکتا ہے اور آس پڑ وس والے بھی اس کے متاثر ہو سکتے ہیں ۔ یا کوئی بہت بلند آواز سے پڑ ھنے لگے جس سے دوسرے تنگی محسوس کریں یا گاڑ ی، موٹر سائیکل یا سائیکل میں ایسے پریشر ہارن لگائیں جو دوسروں کے لیے انتہائی تکلیف اور اذیت کا باعث بنیں یہ سب دوسروں کو اذیت میں مبتلا کرنے کی مثالیں ہو سکتی ہیں ۔یا کبھی گھر میں جھگڑ نے اور بہت زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں جس کی

حکمت سمجھ میں نہ آتی ہویا کبھی بچوں کو روتا چھوڑ دیا جائے جب کہ دوسری طرف گھر میں مہمان بیٹھے ہوں اور گھر والے اس کی پروا نہ کریں یا کبھی عورتیں اتنی بلند آواز سے بولیں کہ گھر میں بیٹھے مہمانوں یا پڑ وسیوں تک کو آوازیں جانے لگیں یہ اور ایسے تمام امور ادب و تمیز کے خلاف ہیں ۔
امام حسن البنا اپنی وصیتوں میں ایک جگہ فرماتے ہیں : اپنی آواز کو اتنابلند کرو جتنا سامعین برداشت کر سکیں کیوں کہ بہت بلند آواز رعونت اور ایذا ہے ''۔ لڑ ائی میں آواز بلند کرنا ہنسنا یا قہقہہ لگانا رعونت نفس کے اثر سے ہوتا ہے ۔ آواز کو کو بلند کرنے سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے ۔یہی نہیں بلکہ یہ سامعین کا بھی عدم احترام ہے اور یہ گفتگو اور کلام کے آداب کے بھی خلاف ہے ۔
خواتین کو خاص طور پر ان امور کے بارے میں ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے ۔ پڑ وسیوں کے معاملے میں بھی اسی طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کیوں کہ بچے اکثر لڑ تے جھگڑ تے ہیں اور معاملہ بڑ وں کی لڑ ائی تک جا پہنچتا ہے کبھی یہ عزیز و اقارب اور رحم کے رشتوں تک پھیل جاتا ہے ۔ اورناراضی کا سبب بن جاتا۔ یہ سب تربیت کے نقص و کمی کے باعث ہوتا ہے ۔ اگرچہ تربیت درست ہو تو لڑ ائی کی نوبت نہیں آتی، پڑ وسیوں کو اذیت دینا اہل جہنم کا کام ہوتا ہے ۔
ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے : ''ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ فلاں عورت نماز، روزے اور صدقے کا بہت اہتمام کرتی ہے لیکن وہ اپنے پڑ وسیوں کو بھی بہت تکلیف دیتی ہے اس کے بارے میں کیا حکم ہے ؟ فرمایا: وہ جہنمی ہے ۔ اس نے پھر کہا فلاں عورت ہے جو بہت زیادہ نماز، روزہ اور صدقہ تو نہیں کرتی لیکن اپنی زبان سے پڑ وسیوں کو اذیت نہیں دیتی اس کے بارے میں کیا حکم ہے ؟ فرمایا: وہ جنتی ہے ۔ (مسند احمد: ۴۴۰/۲)
ایک اور اہم پہلو گھر کے اور خاص طورپر میاں بیوی کے مابین ہونے والی گفتگو ہے جس کا اظہار نہیں کیا جانا چاہیے ۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ہاں بدترین لوگ وہ ہوں گے جو مرد بیوی کے خلاف اور بیوی مرد کے خلاف دعویٰ کرے گی کہ اس نے اپنا راز نہیں چھپایا۔ (مسلم‘ ابو داؤد) یعنی زوجین ایک دوسرے سے معاملات کو چھپاتے نہیں تھے ۔
اس حدیث میں مسلمان گھرانے کی تربیت کا ایک انداز اور طریقہ بیان کیا گیا ہے ۔ عام طور پر بعض خواتین کی عادت ہوتی ہے وہ جب مل بیٹھتی ہیں تو ان امور کے بارے میں گفتگو ہی ان کا موضوع ہوتا ہے جو لغو اور حماقت کے دائرہ میں آتا ہے اور انتہائی برا عیب ہے ۔ ایسے تمام امور میں بہت احتیاط کی ضرورت ہے ۔ جیسے آواز کو پست رکھنا مطلوب ہے اسی طرح کتمان اسرار (راز کوپوشیدہ) رکھنا بھی مطلوب ہے ۔
[نوٹ یہ سلسلہ مضامین سعید حویٰ کی تصنیف ''البیت المسلم''کی تلخیص و ترجمہ پر مشتمل ہے ۔]

سوال وجواب
بنت عتیق /ابویحییٰ

راہ دین پر استقامت
سوال : السلام علیکم
سر دین کی راہ میں استقامت کے لیے کیا کیا جائے ؟ دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ رباء مہر
جواب: وعلیکم السلام و رحمۃ اللہ وبرکاتہ
دین کی راہ دراصل تزکیہ نفس کی راہ ہے ۔ اور یہ ایک دن ، ایک مہینے یا ایک سال کا کورس نہیں بلکہ ایک مسلسل جدوجہد کا نام ہے ۔ اس لیے اس راہ کا مسافر بننے کے لیے مستقل Motivation اور استقامت لازمی ہے ۔ یہ بھی لازم ہے کہ اس سفر کی شروعات صحیح اور نفع بخش علم اور بہترین حلقہ احباب کے ساتھ کی جائے ۔انگریزی کا ایک مقولہ ہے کہ :
.Motivation Does not last for long, so does bathing. Thats why we recommend it daily
یعنی جس طرح جسمانی طہارت کے لیے ہر دن صفائی کی ضرورت پڑ تی ہے ، اسی طرح نفس کی طہارت

حاصل کرنے کے لیے بھی ہر روز اپنے جذبے ، نیت اور ارادے کو مضبوط کرنا پڑ تا ہے ۔ ہر نئے دن کی شروعات اس مضبوط ارادے کے ساتھ کرنی ہوتی ہے کہ شیطان کے خلاف اس جنگ میں کمزور نہیں پڑ نا۔ اپنے خالق و مالک کے احسانات کو یاد کر کے اس کے مطالبات کو ذہن میں تازہ کرتے رہنا چاہیے ۔
اس مسلسل یاد دہانی کا سب سے بہترین ذریعہ تو ہمارے رحیم رب نے ہمیں نماز کی صورت میں عطا کر ہی دیا ہے ۔ ہر نماز میں اگر خدا کی عظمت کا احساس، اور اس کے احسانات کا بوجھ دل پر غالب رہے تو انسان کے عجز کا وہ عالم ہوتا ہے کہ یہ نماز اسے اس کے بعد ایمان و اخلاق کی ہر آلائش سے محفوظ رکھتی ہے ۔ ہر سجدے میں گویا خدا کے قدموں میں گر کر یہ عہد کر لیجیے کہ اس کی مرضی کے خلاف نہ کچھ سوچنا ہے نہ کرنا ہے ۔
اس کے علاوہ قرآن پاک کو ترجمہ و تفسیر کے ساتھ سمجھ کر پڑ ھنے کی عادت ڈالیں ۔ یوں ہر روز اللہ تعالیٰ کے مطالبات کا اعادہ ہوتا رہے گا۔
تیسرا یہ کہ ایسے حلقوں یا ایسی سرگرمیوں میں اپنے آپ کو مصروف رکھیں جو آخرت کی یاد دہانی کرواتی رہیں ۔ اور خود جو اچھی بات سیکھیں وہ دوسروں تک پہنچائیں ۔ اس سے آپ کے اپنے تزکیہ نفس میں بہت مدد ملے گی۔
ان سب اقدامات کے باوجود بھی کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دوری سی محسوس ہوتی ہے ۔ یہ اس لیے کیونکہ اقدامات صرف ہم ہی نہیں کرتے ، شیطان بھی اپنے حربے استعمال کرتا ہے ۔ ان لمحوں میں گھبرا کر اپنے معمولات میں تبدیلی نہ لائیں ۔ عبادت و ذکر جاری رکھیں اور اللہ تعالیٰ سے ا ن کا قرب مانگیں ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو حکمت و معرفت نصیب فرمائیں ۔

ایک قول کی نسبت
سوال: السلام علیکم
امید ہے کہ آپ اور آپ کے اہل خانہ بخیر ہوں گے ۔ میں اس حدیث کے اصل الفاظ اور منبع کی تلاش میں ہوں جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کا مفہوم کچھ یوں ہے کہ:
''جس کو سچ بات پتہ تھی لیکن اس نے اس کا بیان نہیں کیا وہ روز قیامت گونگے شیطان کی طرح اٹھایا جائے گا۔''
اگر آپ یہ تلاش کرنے میں میری مدد کریں اور اس کی کچھ وضاحت بھی کر دیں تو میں آپ کا شکر گزار ہوں گا ۔
جواب: الحمدللہ میں خیر و عافیت سے ہوں ۔امید ہے کہ آپ اور آپ کے اہل خانہ بھی صحت و عافیت کی بہترین حالت میں ہوں گے ۔ مذکورہ بالا قول اصل اس طرح ہے ۔
من سکت عن الحق فہو شیطان أخرس
یعنی حق کے معاملے میں خاموش رہنے والا گونگا شیطان ہے ۔ یہ نہ کوئی حدیث ہے نہ مسلمانوں کے علمی ذخیرے میں کہیں اس قول کو کسی صحیح یا ضعیف روایت کے طورپرنبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر کے بیان کیا جاتا ہے ۔ یہ اہل علم کی کتابوں میں ایک قول کے طورپر ہی بیان ہوا ہے ۔ جیسا کہ امام ابن تیمیہ کے مجموع الفتاوی میں اس کا ذکر ملتا ہے ۔ تاہم مسلمانوں کے علمی ذخیرے میں یہ قول سب سے پہلے امام ابوالقاسم القشیری وفات 465 ہجری کی مشہور تصنیف رسا لۃ القشیریہ کے باب ''الصمت'' کے ذیل میں ملتا ہے ۔ انھوں نے اس قول کو اپنے استاد ابو علی الدقاق کی ایک بات کے طورپر بیان کیا ہے ۔ گویا کہ وہی اس کے پہلے بیان کرنے والے ہیں ۔

مضامین قرآن (16)
دلائل آخرت :ترتیب و تدریج کی دلیل
جوڑ ے کی دلیل پر ایک اعتراض
قرآن مجید قیامت کے دن اور آخرت کی زندگی کو عقلی بنیادوں پر ثابت کرنے کے لیے جو عام فہم دلائل دیتا ہے ان میں سے ایک اہم دلیل جوڑ ے کی دلیل ہے ۔اس دلیل پر پچھلی قسط میں تفصیل سے گفتگو کی گئی تھی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کائنات کی اکثر و بیشر چیزیں جوڑ ے جوڑ ے کی شکل میں تخلیق کی گئی ہیں ۔ جوڑ ے کے ایک ہی جزکو اگر دیکھا جائے گا تو اس کی مقصدیت ہرگز واضح نہیں ہو گی۔ یہ مقصدیت اسی وقت واضح ہو گی جب جوڑ وں کے دونوں اجزا سامنے ہوں گے ۔اس ضمن میں قرآن کریم متعدد مثالیں دے کر یہ واضح کرتا ہے کہ اس دنیا کی ہر چیز نہ صرف جوڑ ے جوڑ ے کی شکل میں بنی ہے بلکہ جوڑ ے کے دونوں اجزا مل کر ہی ایک بامقصداکائی یا کُل بناتے ہیں ۔جوڑ ے کا ہر جز اپنی جگہ مکمل ہوتا ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ کمی ہوتی ہے ۔چنانچہ جوڑ ے کے ایک جز میں جو کمی ہوتی ہے دوسرا جزاس کی تکمیل کر دیتا ہے ۔ مثلاً مرد و عورت دونوں اپنی جگہ مکمل ہستی ہیں لیکن جب یہ دونوں ملتے ہیں تب ہی ان کی نفسیات بھی تسکین پاتی ہے اور وہ نسل انسانی آگے بڑ ھانے کا مقصد بھی سرانجام دیتے ہیں ۔اسی طرح مرد میں قوت وتوانائی ہے جو خاندان اور بچوں کے تحفظ کے لیے ضروری ہے تو اس میں اُس نرمی اور برداشت کی کمی ہوتی ہے جو ناتواں بچوں کی ذمہ داری کو اٹھانے کے لیے لازمی ہے ۔عورت مرد کی یہی کمی پوری کرتی ہے ، گرچہ وہ جسمانی قوت میں مرد سے کم ہوتی ہے ۔
یہی معاملہ دنیا اور آخرت کا ہے ۔ آخرت کی دنیا موجودہ دنیا کا جوڑ ا ہے ۔موجودہ دنیا کا نامکمل وجود، جس پر مقصدیت کی دلیل کے ضمن میں تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے ، اس بات کا تقاضہ کرتا ہے کہ اس کا ایک جوڑ ا ہو۔ یہ دنیا اگر دار الامتحان ہے تو ضروری ہے کہ ایک دار الجزا ہو۔ یہ دنیا فانی ہے تو وہ دنیا ابدی ہو۔ یہ دنیا محدود ہے تو وہ دنیا لامحدود ہو۔ چنانچہ یہ اصول اگر درست ہے کہ اس دنیا میں ہر چیز کا ایک جوڑ ا ہے تو یہ بات مان لینا عین عقلی چیز ہے کہ خود اس دنیا کا بھی ایک جوڑ ا ہے ۔ یہ جوڑ ا وہی آخرت ہے جس کا بیان قرآن مجید کرتا ہے ۔
اس دلیل پر ایک معقول اعتراض یہ کیا جا سکتا ہے کہ دنیا کا ہر جوڑ ا ہمیں اپنی آنکھوں سے نظر آ جاتا ہے ۔ مرد ہماری نظر کے سامنے ہوتے ہیں تو عورتوں کے وجود کو بھی ہم دیکھتے ہیں ۔ زمین ہمارے پیروں تلے ہے تو آسمان کی چھتری کا مشاہدہ بھی ہمارا روزمرہ ہے ۔نشیب میں بہتے دریا ہم نے دیکھے ہیں تو فلک بوس اور صدیوں سے اپنی جگہ قائم پہاڑ بھی ہمارے سامنے ہیں ۔ لیکن آخرت کو تو کسی نے نہیں دیکھا۔ یہ تو محض ایک خبر ہے ۔ایک اطلاع ہے ۔اس خبر کو کس بنیاد پر درست مان لیا جائے ۔یہی نہیں بلکہ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مکہ کا قیامت پر ایک اہم اعتراض یہ تھا کہ جس قیامت کی خبر دی جا رہی ہے اس کو کو فوراًبرپا کر کے دکھایا جائے ۔ یا کم از کم اس کا وقت ہی بتادیا جائے ۔یہ اعتراض ایک پہلو سے قیامت کی خبر کا مذاق اڑ انے کا عمل تھا اور ایک دوسرے پہلو سے ایک عقلی اشکال تھا کہ خدا اگر قادر مطلق ہے اور اس کے پیغمبر سچے ہیں تو اس قادر مطلق خدا کو اپنے سچے پیغمبرصلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے بعد قیامت کو برپا کرنے سے کیا چیز روک رہی ہے ۔
کائنات میں رائج ترتیب وتدریج کا قانون
یہی وہ پس منظر ہے جس میں قرآن مجید ہمارے سامنے ان مثالوں اور مشاہدات کو رکھتا ہے جو یہ حقیقت واضح کرتی ہیں کہ اس کائنات میں اللہ تعالیٰ کا طریقہ تخلیق بلاشبہ جوڑ وں کی شکل میں ہے ، مگر اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر جوڑ ا ایسا نہیں ہوتا جس کے دونوں اجزا بیک وقت ہمار ے سامنے ہوں ۔ بلکہ بہت سے جوڑ ے ایسے ہیں کہ ایک وقت میں ان کا ایک ہی جزہماری نظروں کے سامنا ہوتا ہے ۔ وہ اپنے دوسرے جز سے اتنا مختلف ہوتا ہے کہ اس کے ہوتے ہوئے دوسرے جز کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ہم سب جانتے ہیں کہ ایک وقت آتا ہے کہ جوڑ ے کا پہلا جز ہماری آنکھوں سے اوجھل ہوجاتا ہے اور دوسرا جز اس کی جگہ لے لیتا ہے ۔اس دوسر ے جز کا ظہور پذیر ہونا یقینی ہوتا ہے لیکن اللہ کی حکمت اور اس کے قانون تخلیق کا تقاضہ یہ ہے کہ یہ ایک دم سے ظاہر نہ ہو بلکہ بتدریج اپنے مقرر وقت پر ظاہر ہو۔

اس کی سب سے نمایاں مثال دن اور رات کا جوڑ ا ہے ۔ ان کا جوڑ ا ہونا، بامقصد جوڑ ا ہونا اور جوڑ ے کے اجزا کا ایک دوسرے سے متضاد ہونا ایک ناقابل تردید حقیقت ہے ۔ اگر دنیا میں ہمیشہ دن رہے تو زندگی ختم ہوجائے گی۔ اسی طرح اگر دنیا میں ہمیشہ کے لیے رات طاری ہوجائے تب بھی حیات کا امکان اپنی موت آپ مرجائے گا۔ مگر یہ دونوں ایک خوبصورت تناسب سے ملتے ہیں اور اس دنیا میں ایک کے بعد ایک کر کے آتے ہیں ۔ جس کے نتیجے میں دنیا میں زندگی کا معجزہ وجود میں آتا ہے ۔

رات اور دن کی اس ترتیب کے تصور سے ناواقف کوئی شخص اگر رات کے بارہ بجے اس حال میں پیدا ہو کہ وہ مکمل شعور رکھتا ہو، سوچ سکتا ہو اور چیزوں کو دیکھ کر ان کی حقیقت سمجھ سکتا ہو تو وہ رات ، اندھیرے ، چاند اور تاروں کے وجود کو تو فوراً مان لے گا، مگر رات میں اسے یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ اس دنیا میں دن کے نام کی ایک حقیقت بھی پائی جاتی ہے جس میں اجالا ہوتا ہے ، سورج ہوتا ہے اوردھوپ ہوتی ہے ۔مگرجیسے ہی صبح طلوع ہو گی رات ڈھل جائے گی اور دن طلوع ہوجائے گا اور وہ شخص خود مان لے گا کہ دن بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے ۔ قرآن کریم اسی مثال کو سامنے رکھ کر بیان کرتا ہے کہ رات کے بعد طلوع فجر کے وقت دن کا آنا مقدر ہوجاتا ہے اور دن کے بعدظہور شفق کے وقت رات کا آنا طے ہوجاتا ہے ۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی وہی طلوع فجر ہے جس کے بعد نیکوکاروں کے لیے جنت کے دن اور وہی ظہور شفق ہے جس کے بعد بدکاروں کے لیے جہنم کی رات کا آنا بس اب تھوڑ ی ہی دیر کی بات ہے ۔

چنانچہ لوگوں کو چاہیے کہ حیل و حجت کرنے کے بجائے رات اور دن کی اس دلیل سے آخرت کو سمجھیں ۔ ظلم اور فساد کے موجودہ اندھیرے کے بعد لازمی ہے روز قیامت کا سورج طلوع ہو گا اور کبھی نہ ختم ہونے والی روشنی سے زمین جگمگا اٹھے گی۔ یہ الگ بات ہے کہ جن لوگوں نے معصیت و نافرمانی کے چراغوں سے اِس دنیا میں اپنی زندگی کو روشن کیے رکھا ، وہ جہنم کے ابدی اندھیروں میں دھکیل دیے جائیں گے ۔

چاند کی مثال

قرآن مجید دن اور رات کے ایک ترتریب کے ساتھ باری باری آنے جانے سے یہ استدلال ہی نہیں کرتا بلکہ یہ بھی واضح کرتا ہے کہ ان کا آنا جانا ایک دم سے نہیں ہوتا بلکہ ترتیب کے ساتھ یہ واقعہ تدریجاً وقو ع پذیر ہوتا ہے ۔ یہی اللہ تعالیٰ کا دنیا کے بارے میں فیصلہ ہے کہ یہاں چھائے ہوئے بدی کے اندھیرے قیامت کی روشنی سے ایک روز ضرور دور ہوجائیں گے مگر یہ سب کچھ ایک دم نہیں ہو گا بلکہ تدریج کے ساتھ ہو گا۔ جیسے چاند اپنا سفر طے کرتا ہے ۔مہینے کے ابتدائی دس دن چاند کے عروج کے ہوتے ہیں ۔ اگلے دس دنوں میں چاند بدر کامل بن جاتا ہے اور پھر اس کا زوال شروع ہوجاتا ہے ۔ پھر آخر کے دس دنوں میں چاند تیزی سے گھٹتا ہے اور مہینے کے آخر میں غائب ہوجاتا ہے ۔ یہ دس دس دنوں پر مشتمل یہ قمری مہینہ کبھی طاق یعنی 29دنوں کا ہوتا ہے اور کبھی جفت یعنی 30دن کا ہوتا ہے ۔ایک عام آدمی اپنے مشاہدے کی بنیاد پر پہلے سے نہیں جان سکتا کہ نیا مہینہ 29دن کے بعد طلوع ہو گا یا پھر 30کے بعدیہ گویا ایک غیر یقینی کی کیفیت ہوتی ہے جس میں قیامت کے آنے کی طرح، نئے مہینے کے آغاز کا علم نہیں ہوتا، گرچہ اس کا آنا ، قیامت کے آنے کی طرح ، یقینی ہوتا ہے ۔ پھر اچانک نئے مہینے کا چاند افق پر نمودار ہوجاتا ہے ۔ ٹھیک اسی طرح تدریج کے ساتھ یہ دنیا اپنی ابتدا سے اپنے انجام کو پہنچے گی اور ایک ایسے مہینے میں جس کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ وہ 29کا ہو گا یا پھر 30کا اچانک نئی دنیا کا آغاز ہوجائے گا۔

قرآنی بیانات

دن اور رات ، شفق اور فجر، قمری مہینے کے دس دس ایام اور ان میں چاند کے سفر سے اس طرح استدلال کیا گیا ہے ۔

پس نہیں ، میں قسم کھاتا ہوں شفق کی اور رات کی اور ان چیزوں کی جن کو وہ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے اور چاند کی جب وہ پورا ہو جاتا ہے کہ تم کو لازماً چڑ ھنا ہے درجہ بدرجہ۔
(سورۃ الانشقاق16:84-19)

شاہد ہے فجر اور دس راتیں اور جفت و طاق اور رات جب وہ چل کھڑ ی ہو۔ کیوں ، ان میں تو ہے ایک عاقل کے لیے عظیم شہادت!(سورۃ الفجر89: 1-5)

پس نہیں ، میں قسم کھاتا ہوں پیچھے ہٹنے والے ، چلنے والے اور چھپ جانے والے ستاروں کی اور رات کی جب وہ جانے لگتی ہے اور صبح کی جب وہ سانس لیتی ہے کہ یہ ایک باعزت رسول کا لایا ہوا کلام ہے ۔
(سورہ تکویر81:15-19)
ہرگز نہیں ، شاہد ہے چاند اور رات جبکہ وہ پیٹھ پھیر لیتی ہے اور صبح جب روشن ہو جائے کہ یہ ماجرا ان بڑ ے ماجروں میں سے ہے جو انسان کی تنبیہ کے لیے سنایا گیا۔
(سورة المدثر74: 32-35)
قیامت کے ظہور کو دن کی روشنی سے اس طرح تشبیہ دی گئی ہے ۔
اور زمین اپنے رب کے نور سے چمک اٹھے گی اور رجسٹر رکھا جائے گا اور انبیا اور گواہ حاضر کیے جائیں گے اور لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا اور ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ (سورة الزمر39:69)
قیامت کے وعدے کو ابھی پورا کرنے اور اس کے آنے کے وقت پر کفار کے سوالات کو ایسے بیان کیا گیا ہے ۔
اور وہ کہتے ہیں کہ یہ دھمکی کب پوری ہو گی، اگر تم لوگ سچے ہو! کہہ دو، یہ علم اللہ ہی کے پاس ہے ، میں تو بس ایک کھلا ہوا ڈرانے والا ہوں ۔ پس جب وہ اس کو دیکھیں گے قریب آتے تو ان لوگوں کے چہرے بگڑ جائیں گے جنھوں نے کفر کیا۔ اور ان سے کہا جائے گاکہ یہی ہے وہ چیز جس کا تم مطالبہ کر رہے تھے ۔ (سورة الملک67:-25-27)
اور یہ کہتے ہیں کہ کیا جب ہم ہڈیاں اور ریزہ ریزہ ہو جائیں گے تو ہم از سر نو اٹھائے جائیں گے ! کہہ دو کہ تم پتھر یا لوہا بن جاؤ یا کوئی اور شے جو تمہارے خیال میں ان سے بھی سخت ہو۔ پھر وہ کہیں گے کہ ہمیں کون دوبارہ زندہ کرے گا؟ کہہ دو کہ وہی جس نے تم کو پہلی بار پیدا کیا۔ پھر وہ تمہارے آگے سر ہلائیں گے اور کہیں گے کہ یہ کب ہو گا؟ کہہ دو کہ عجب نہیں کہ اس کا وقت قریب ہی آ پہنچا ہو۔ (سورہ بنی اسرائیل17:49-51)
[جاری ہے]

مبشر نذیر
ترکی کا سفرنامہ(20)
ترک عصبیت

دوسری قوموں کی طرح ترکوں میں بھی قومی عصبیت پائی جاتی ہے مگر ان کی عصبیت تعمیری ہے ۔ علم سماجیات کے بانی ابن خلدون کے مطابق عصبیت سے ہی قوم بنتی ہے ۔ انسان کے اندر یہ جذبہ ہوتا ہے کہ وہ خود کو ایک گروہ یا قوم کا حصہ سمجھتا ہے ۔ کسی قوم میں یہ جذبہ جتنا طاقتور ہوتا چلا جاتا ہے ، اتنا ہی قوم متحد ہو کر تعمیر کے راستے پر چلتی چلی جاتی ہے ۔
ہمارے ہاں قومی عصبیت کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ دوسری قوموں سے نفرت کی جائے اور اپنی قوم سے محبت۔ ترکوں کے ہاں ایسی عصبیت پائی نہیں جاتی۔ ان کے ہاں عصبیت کا معنی ہے کہ اخلاق اور کردار میں دوسری اقوام سے بہتر بنا جائے ۔ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تعمیری بنا جائے ۔ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ اچھے انسان بنا جائے ۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی میں اخلاق کا معیار بہت بلند ہے ۔ کرپشن بہت ہی کم ہے ۔ لوگ اچھے ہیں اور ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں ۔ غیر ملکیوں کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو خاص طور پر اس کی مدد کی جاتی ہے ۔
ہمارے ہاں بھی اعلی اخلاق کے حامل افراد کی کمی نہیں ہے ۔ میرا تجربہ ہے کہ تعمیری لوگ کم ہی متعصب ہوا کرتے ہیں ۔ زیادہ تر تعصب ان لوگوں میں پایا جاتا ہے جن میں خود کوئی کمی ہو۔ ایسے لوگ اپنے

احساس کمتری کو چھپانے کے لئے تعصب کی آڑ لیتے ہیں ۔آپ شاید ہی کسی اعلی تعلیم یافتہ ایگزیکٹو،
ڈاکٹر، انجینئر یا کامیاب بزنس مین کو تعصب میں مبتلا دیکھیں گے ۔ اس کے برعکس ایسے لوگ جو کاروبار
میں ناکام رہ جائیں ، ملازمت حاصل نہ کر سکیں ، یا سرے سے کام ہی نہ کرنا چاہتے ہوں ، تعصب کا شکار
ہو جاتے ہیں ۔ ایسے افراد کو سیاسی جماعتیں اپنے مقاصد کے لئے قابو کر لیتی ہیں ۔ یہی لوگ ہیں جو
احتجاجی مظاہروں میں نکلتے ہیں ، پتھراؤ کرتے ہیں ، گاڑ یاں جلاتے ہیں ، گھروں کے شیشے توڑ تے ہیں
اور پٹرول پمپ اور بینک لوٹتے نظر آتے ہیں ۔
ہمارے ہاں جلسے جلوس کو بڑ ی اہمیت دی جاتی ہے ۔ ذرا ذرا سی بات پر جلوس نکال کر معیشت کا پہیہ جام
کر دیا جاتا ہے ۔ ایسا کرنے والے یہ نہیں سوچتے کہ ان کے اس عمل سے کتنے گھروں میں چولہا نہ جل
پائے گا۔ ہمارے ایک جاننے والے اپنی آنکھوں دیکھا منظر بیان کرتے ہیں کہ وہ کراچی کے صدر بازار میں
کسی کام سے گئے ۔ ان دنوں پاکستان میں شراب پر پابندی نہیں تھی اور کھلے عام شراب فروخت ہوا کرتی
تھی۔ کچھ لوگ اس کے خلاف جلوس نکال کر احتجاج کر رہے تھے ۔ صدر پہنچ کر شراب کی دکان کے
سامنے یہ جلوس مشتعل ہو گیا اور انہوں نے شراب کی دکان پر حملہ کر دیا۔ اندر پہنچ کر جس کے ہاتھ میں
شراب کی جو بوتل لگی، اس نے لوٹ کر اپنے تھیلے میں ڈالی اور اس کے بعد دکان کو آگ لگا دی۔ یہ وہ
حضرات تھے جو شراب کے خلاف احتجاج کر رہے تھے ۔
اگر ہم اس تکلیف دہ کلچر سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں بھی خود کو تعمیری اور مثبت بنانا ہو گا۔
قوم کی تعمیر صرف اور صرف تعلیم اور اخلاقی تربیت سے ہوتی ہے ۔ ہمارے جو افراد دین کے لئے
جدوجہد کر رہے ہیں اور وہ اس کام میں مخلص ہیں ، ان کے لئے کرنے کا سب سے بڑ ا کام یہی ہے کہ وہ
قوم کی اخلاقی تربیت کریں ۔ یہی وہ طریقہ ہے جس سے وہ اپنی قوم کو عزت کا مقام دلوا سکتے ہیں ۔ جلسے
جلوسوں سے لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے جبکہ اخلاقی تعمیر سے انہیں اپنے حقوق وصول کرنے کا نہیں
بلکہ دوسروں کے حقوق ادا کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے ۔
[جاری ہے]

پروین سلطانہ حنا

دیا جلاؤ
دیا جلاؤ
اندھیرا بڑ ھتا رہے گا یونہی
جو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہیں گے ہم تم
سو اپنے امکان کی حدوں میں
جو ہو سکے تو دیا جلاؤ
کہ اپنے حصے کا ایک ننھا سا دیا تو میں بھی جلا رہی ہوں
چراغ جب چارسو جلیں گے
تو روشنی کے قدم جمیں گے

ابدی نعمتیں کن کے لیے ہیں

’’جوکچھ بھی تم لوگوں کودیا گیا ہے وہ محض دنیاکی چند روزہ زندگی کاسروسامان ہے ، اورجوکچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتربھی ہے اورپائیداربھی-وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو:
ایمان لائے ہیں ۔
اوراپنے رب پربھروسہ کرتے ہیں ۔
اورجوبڑ ے بڑ ے گنا ہوں اوربے حیائی کے کاموں سے پرہیزکرتے ہیں ۔
اوراگر غصّہ آجائے تودرگزرکرجاتے ہیں ۔
اورجواپنے رب کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں ۔
اور نمازقائم کرتے ہیں ۔
اور ان کا نظام شوریٰ پر ہوتا ہے ۔
اورہم نے جوکچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں ۔
اورجب ان پرزیادتی کی جاتی ہے تواس کامقابلہ کرتے ہیں ۔ ۔ ۔ برائی کابدلہ ویسی ہی برائی ہے ، پھرجوکوئی معاف کر دے اوراصلاح کرے اس کا اجراللہ کے ذمہ ہے ، اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا۔ اورجولوگ ظلم ہونے کے بعدبدلہ لیں ان کوملامت نہیں کی جا سکتی، ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جودوسروں پرظلم کرتے ہیں اورزمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے ۔
اور جس نے صبر کیا اورمعاف کیا ، تو بے شک یہ بڑ ی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے ۔‘‘
(شوریٰ42:36-43)